فہرست

مضمون نگاران معارف

۷۰ ویں جلد

ماہ جولائی ۲۰۰۲ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱۔	جناب اروندھتی رائے صاحب، (انگریزی کی مشہور مصنفہ)	۳۰۴
۲۔	جناب اسلم مرزا صاحب، ۸ر سلیم کامپلکس، پہلا منزلہ ڈیوڑھی بازار، اورنگ آباد	۴۱
۳۔	جناب اقبال رودولوی صاحب درگاہ شریف رودولی، فیض آباد	۳۹۷
۴۔	پروفیسر اکبر رحمانی صاحب (مرحوم) ڈائرکٹر ایجوکیشنل اکاڈمی، جلگاؤں	۱۵۱
۵۔	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی صاحب، لوکو کالونی، نئی آبادی، علی گڑھ	۳۹۵
۶۔	پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی، حبیب منزل، علی گڑھ	۳۱۳
۷۔	ضیاء الدین اصلاحی	۴، ۶۱، ۶۸، ۷۳، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۳، ۲۴۵، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۹۰، ۳۹۲، ۴۰۳، ۴۶۹، ۴۷۷
۸۔	مولوی ضیاء الرحمان اصلاحی	۵۲، ۳۱۰
۹۔	پروفیسر عبدالاحد رفیق صاحب اپر صورہ، سری نگر، کشمیر	۲۹۶، ۳۸۰
۱۰	جناب عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ	۳۱۴
۱۱۔	جناب عبدالقوی دسنوی صاحب پرنس کالونی، عید گاہ، ہل، بھوپال	۳۱۵
۱۲۔	"ع۔ص" حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین	۷۵، ۱۵۶، ۲۳۷، ۳۶۷، ۳۹۸
۱۳۔	کلیم صفات اصلاحی، اسکالر دار المصنفین	۱۰۲، ۳۳۲، ۴۲۰، ۴۶۶
۱۴۔	جناب محمد بدیع الزماں صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف پٹنہ	۳۶۵
۱۵۔	پروفیسر محمد حسان خاں صاحب، شعبۂ عربی برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال	۱۷۷

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱۶-	جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی مرحوم سابق جنرل سکریٹری، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور	۸۵، ۱۶۵ ۳۰۵		جناب وارث ریاضی صاحب	۲۶۶، ۱۶
۱۷-	ڈاکٹر محمد صادق حسین صاحب ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی	۴۴۵	۲۶-	کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، مغربی چمپارن، بہار	۳۹۶
۱۸-	جناب مولانا محمد عارف عمری رفیق دارالمصنفین	۳۸۸	۲۷	ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی صاحب عائشہ کمپلکس، کلیان سوسائٹی، واڑوڑا	
۱۹-	ڈاکٹر محمد کاظم صاحب سب ایڈیٹر آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی	۳۰۷			
۲۰-	جناب مسعود انور علوی کاکوروی ریڈر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۱۲			
۲۱-	جناب سید مصطفی علی بریلوی صاحب ایڈیٹر سہ ماہی "العلم" آل پاکستان ایجوکیشنل، کراچی	۳۴			
۲۲-	ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد صاحب جی، ۴۷، سفینۂ عباسی، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ	۵			
۲۳-	پروفیسر معزز علی بیگ صاحب لکھنؤ	۳۱۲			
۲۴-	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی، کراچی	۱۸، ۱۹۸			
۲۵-	ڈاکٹر نوراسعید اختر صاحب پونم نگر، اندھیری ایسٹ ممبئی	۱۲۹			

مضامین معارف

۱۷۰ ویں جلد

ماہ جولائی ۲۰۰۲ء تا ماہ دسمبر ۲۰۰۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون	صفحات	نمبر شمار	مضمون	صفحات
۱-	شذرات	۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲		ایک نادر تذکرہ	
			۸-	شہر بریلی کی عمارات	۳۴
			۹-	صلحی خراسانی	۱۲۹
	مقالات		۱۰-	عبدالقادر فخری مہربان	۲۸۷
۱-	اسپین سے مسلمانوں کا اخراج اور عثمانی سلطنت، تاریخ اندلس کا ایک ورق	۱۷۷	۱۱-	عرب جاہلیت کی معاشرت کی ایک جھلک	۱۸، ۱۹۸
			۱۲-	علامہ اقبال اور احمدیت	۲۶۶
۲-	اسلامی عقائد کے بارے میں چند اصولی باتیں ترجمان القرآن، مولانا حمیدالدین فراہی کے افادات	۲۸۵	۱۳-	علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت	۳۲۵
			۱۴-	فضائے وسیع ہماری پرواز کی مختصر ہے	۳۰۷
۳-	افغانستان	۱۰۲، ۳۴۲	۱۵-	قاضی عبدالنبی احمد نگری	۱۳۱
		۴۲۰	۱۶-	قرآن عظیم کے سائنٹفک دلائل	۳۰۵
۴-	تحریک نقطوی اور "دین الٰہی" پر اس کے اثرات	۵	۱۷-	کلیات اقبال میں انبیاء اور صحابہ پر اشعار کے اشارے	۳۶۵
۵-	حضرت مولانا شاہ تقی علی حیدر قلندر کاکوروی	۲۱۲	۱۸-	مرزا محمد طاہر آشنا	۲۹۶
			۱۹-	مسلمان اور جدید علوم و فنون	۳۸۰
۶-	سائنسی علوم کی اہمیت اصول فقہ کی روشنی میں	۸۵، ۱۶۵	۲۰-	مکاتیب میں اقبال کی مخصوص روش اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	۱۵۱
۷-	سفینۂ عشرت: فارسی شعراء کا	۴۴۵	۲۱-	نیوکلویم ..... گرمیوں کے کھیل	۳۰۳

جولائی ۲۰۰۲ء

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ (ہند) ۲۷۶۰۰۱

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	اخبار علمیہ	۳۶۶،۳۱۰
	معارف کی ڈاک	
۱۔	اصلاح طلب بات	۳۱۳
۲۔	ایک اہم خط	۳۱۲
۳۔	تاریخی غلطی	۳۱۴
۴۔	گجرات میں رقص ابلیس	۳۱۵
	تلخیص و تبصرہ	
۱۔	جرمنی میں اسلام اور مسلمان	۵۲
	وفیات	
۱۔	پروفیسر اکبر رحمانی	۳۹۲
۲۔	جناب عبد اللطیف اعظمی	۶۱
۳۔	جناب کیفی اعظمی	۶۸
۴۔	جناب مولوی محمد مسعود خاں	۷۳
۵۔	جناب فہیم صدیقی صاحب	۳۹۰
	استفسار و جواب	
۱۔	علامہ شبلی پر تحریف کا الزام	۳۸۸

نمبر شمار	مضمون	صفحات
	باب التقریظ والانتقاد	
۱۔	کچھ یادیں کچھ باتیں	۳۶۹
	ادبیات	
۱۔	الکہائے غم	۳۹۶
۲۔	صدائے کشتگاں	۳۹۵
۳۔	غزل	۳۹۷
۴۔	غزل	۳۹۷
۵۔	وہ سر سید جسے دانش ور بالغ نظر کہے	۳۱۶
	مطبوعات جدیدہ	۱۵۶،۷۵
		۳۱۷،۲۳۷
		۳۷۷،۳۹۸

مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس[25] پونڈ یا چالیس[40] ڈالر

بحری ڈاک نو[9] پونڈ یا چودہ[14] ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۰ ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۰۲ء عدد ۱

فہرست مضامین

شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۲–۴

مقالات

تحریک نقطوی اور "دین الٰہی" پر اس کے اثرات	ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد صاحب	۵–۱۷
عرب جاہلیت کی معاشرت کی ایک جھلک	ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحب	۱۸–۳۳
شہر بریلی کی عمارات	جناب سید مصطفیٰ علی بریلوی صاحب	۳۴–۴۰
قاضی عبد النبی احمد نگری	جناب اسلم مرزا صاحب	۴۱–۵۱

تلخیص و تبصرہ

جرمنی میں اسلام اور مسلمان	ضیاء الرحمٰن اصلاحی	۵[illegible]–۶۰

وفیات

جناب عبد اللطیف اعظمی	"ض"	۶۱–۶۸
جناب کیفی اعظمی	"ض"	۶۸–۷۲
جناب مولوی محمد مسعود خاں	"ض"	۷۳–۷۴
مطبوعات جدیدہ	ع۔ ص۔	۷۵–۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے باوقار اور غیر متنازع فیہ ادارہ ہے، اس کا سولہواں سہ روزہ اجلاس ۲۱ تا ۲۳ جون کو حیدر آباد میں ہوا، جس میں مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو اتفاق رائے سے بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا، ہم انہیں اس کی مبارک باد دیتے ہیں اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے ارکان کو بھی کہ انہوں نے کامل اتفاق رائے سے انتخاب کا کام انجام دیا، موجودہ حالات میں مولانا محمد رابع ندوی سے زیادہ اس کے لئے کوئی اور شخص موزوں نہیں ہو سکتا تھا، وہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور خدمات اور خاندانی و علمی پس منظر کے علاوہ اپنے اعتدال، سلامت روی، معاملہ فہمی اور اصابت رائے وغیرہ کی بنا پر بھی اس کے اہل تھے، ان سے توقع ہے کہ اس باوقار ادارے کو اختلاف و انتشار سے بچا کر اس کی صحیح رہنمائی کریں گے گو اس وقت ملک کے حالات بڑے نازک اور مسلمانوں کے لئے نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حالات تبدیل ہونے میں دیر نہیں لگتی، خود مولانا نے صدر منتخب ہونے کے بعد فرمایا کہ گجرات جیسے حالات مسلمانوں کو اس ملک سے ختم نہیں کر سکتے، وہ قیامت تک باقی رہیں گے، جو قوم زندہ رہنے کا عہد کرلے اسے کوئی نہیں مار سکتا، مدارس دین کی بنیاد ہیں، ان کا خاتمہ دین کا خاتمہ ہے، مسلمان دشواریوں اور مشکلات کا مقابلہ کریں اور اس کے لئے جوش و ہوش سے کام لیں شریعت کا تحفظ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بقا میرا مشن ہوگا۔

۱۴ مئی ۲۰۰۲ء کو نئی دہلی سے پٹنہ جانے والی شرم جیوی ایکسپریس ڈاؤن صبح ۳-۴ بجے کے درمیان جون پور جاتے ہوئے مانی ہالٹ کے پاس حادثہ کا شکار ہوگئی، مانی کلاں اور اس کے قرب وجوار کے مسلم گاؤں کے لوگ اور ۲ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع گورینی کے مدرسہ ریاض العلوم کے اساتذہ و طلبہ اطلاع ملتے ہی ۴ بجے اندھیرے میں وہاں پہنچ گئے اور ریلیف اور راحت رسانی کا کام کرنے لگے، انہوں نے بلالحاظ مذہب وملت حادثے کی زد میں آجانے والے ڈبوں میں پھنسے مسافروں اور ان کے ساز وسامان کو محفوظ مقامات پر پہنچایا، ان کے لئے دوکانوں سے پانی کی بوتلیں خریدیں اور پانی ختم ہونے پر قریب کے گاؤں سے پانی لالا کر پلایا، ریلوے کا عملہ تین گھنٹے بعد خالی ہاتھ پہنچا اور چھ گھنٹے تک پانی کا کوئی انتظام نہیں کرسکا، حکام اور افسران شامیانے میں آرام کرتے رہے اور پولیس اور پی۔ اے سی کے جوان تربوز کھانے اور گورینی مدرسہ سے لائے گئے مشروبات کے لئے چھینا جھپٹی کرتے رہے، مدرسہ کے طلبہ و اساتذہ کی راحت رسانی پر مختلف ہندی اخباروں نے ان کی بڑی مدح وستائش کی اور ریلوے وزیر نتیش کمار اور سیکورٹی ڈویژنل کمشنر لکھنؤ این کے سکینہ راحت رسانی کے کام سے خوش ہو کر مدرسہ پہنچ

گئے اور طلبہ واساتذہ کا شکریہ ادا کیا، آخر یہ وہی مسلمان اور مدرسے تو ہیں جو نتیش بابو کی حکومت اور باجپائی سرکار کے نفس ناطقہ وزیر داخلہ کی نگاہ میں نہایت ضرر رساں، خطرناک اور دہشت گرد ہیں اور جنہیں ختم کردینے اور بند کرنے کے لئے روزانہ ان پر جھوٹی تہمتیں عائد کی جاتی ہیں اور ان کو فرضی مقدمات میں پھنسایا جاتا ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

گذشتہ مہینے ۲۰ و ۲۱ جون کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی آرٹ فیکلٹی میں "ہندوستان میں اسلامی تہذیب وثقافت اور فلسفے کے فروغ" کے عنوان سے ایک نیشنل سمینار ہوا، جس کا افتتاح کرتے ہوئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے فرمایا کہ ہندوستان مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، یہاں کی اکثریت کو بھی اسلام کے ایک عظیم الشان تہذیبی قوت ہونے اور ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے میں اس کے اخلاقی اور دانشورانہ قدروں کو متاثر کرنے کا اعتراف ہے، لیکن کچھ عرصہ سے یہ جھوٹا الزام لگایا جارہا ہے کہ دنیا کے کچھ ملکوں میں مسلمان حملہ آور بن کر آئے، انہوں نے بتایا کہ ہندوستان میں اخلاقی قدروں کے فروغ دینے اور علم ریاضی، میڈیسین اور دوسرے شعبوں میں اسلام کی شاندار خدمات ہیں، وہ نوع انسان کو اخوت کا پیغام دیتا ہے، مسلم حکمرانوں بالخصوص مغلوں نے ہندوستان کو اپنا وطن عزیز سمجھ کر اس کے ثقافتی ورثے کو مالا مال کیا، سابق وائس چانسلر جناب محمد حامد انصاری نے کہا کہ اس وقت فسطائی جماعتیں ہندوستان میں اسلام کو سیاہ رنگ میں رنگنے کی کوشش کررہی ہیں، ہمیں اکیسویں صدی کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے اپنی خود احتسابی ضروری ہے تاکہ ہندوستان کے نئے ماحول اور سماج میں مسلمان اپنی شاندار خدمات پیش کریں، ۱۸۵۷ء کے حالات کے مقابلے کے لئے مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، اب نئی صدی کے حالات کے مقابلے کے لئے علیگ برادری کو آگے آنا اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا چاہئے۔ اجلاس کے صدر سابق مرکزی خارجہ سکریٹری مسٹر مچکند دوبے نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں اسلام کے رول اور سیکولرزم کے نام پر ہونے والی اس یلغار اور ہندوستانی مسلمانوں میں عدم تحفظ کے احساس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اتنی بڑی اقلیت کو نظر انداز کرکے ملک کے ترقیاتی منصوبے پورے نہیں ہوسکتے، بابری مسجد کا انہدام اور گجرات کا سانحہ اقلیتوں کے دستوری و آئینی حقوق پر حملہ ہے، ستر کی دہائی کے بعد سے ہندوستان کے سیکولرزم کا ڈھانچہ بہت تیزی سے تبدیل ہورہا ہے، جو بڑی تشویش کی بات ہے، سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد رفیق نے سمینار کی ضرورت واہمیت اور غرض وغایت بتائی۔

مقالات کے تین اجلاس ہوئے جن میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر جاوید اشرف،

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی، جامعہ ہمدرد دہلی کی ڈاکٹر ریتا باہگی، شانتی نکیتن کے ڈاکٹر سراج الاسلام، تروپتی یونیورسٹی کے ڈاکٹر مظفر شاہمیری، کشمیر یونیورسٹی کے ڈاکٹر حامد رفیع آبادی، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے جناب محسن عثمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے راقم، حیدر آباد کے پروفیسر انور معظم، دہلی کے پروفیسر رضاء اللہ انصاری اور پروفیسر اقبال انصاری، بھوپال کے ڈاکٹر سید محمد حامد، رام پور کے ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور خود علی گڈھ کے پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر محمد رفیق، پروفیسر عبد العلی، پروفیسر عبد الباری، پروفیسر محمود الحق، پروفیسر اکبر حسین، پروفیسر شیریں موسوی، ڈاکٹر فرخ جلالی، ڈاکٹر تصدق حسین، ڈاکٹر ظفر الاسلام، ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی، ڈاکٹر مسعود حسن اور ڈاکٹر اقبال حسین وغیرہ نے مختلف موضوعات پر مقالات پڑھے جو محنت اور تحقیق سے لکھے گئے تھے اور ان پر بحث و مباحثہ بھی ہوا، سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد رفیق شعبہ فلاسفی کے صدر اور آرٹ فیکلٹی کے ڈین کی حیثیت سے برابر سمینار کراتے رہے ہیں، یہ سمینار سنٹر فار اسٹڈیز ان سولیزیشن (نئی دہلی) نے ان کے تعاون سے کرایا۔

۲۴؍ جون کو راقم نے پروفیسر عبد العلی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام کی دعوت پر اسلامک اسٹڈیز کے شعبے میں "علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت" کے عنوان سے پروفیسر احتشام احمد ندوی کی صدارت میں ایک توسیعی خطبہ دیا، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لا کر اور حاضرین نے بحث و مباحثہ میں حصہ لے کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

مرکزی اور صوبائی حکومتیں اپنے سالانہ بجٹ میں قیمتوں میں سال بہ سال اضافہ تو کرتی ہی رہتی ہیں، لیکن اب دوران سال میں بھی وہ جب چاہتی ہیں قیمتوں میں اضافہ کر دیتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ اضافے کے بعد لوگوں کی زحمتیں اور دشواریاں بھی اسی تناسب سے بڑھ جاتی ہیں، ریل اور بس کا تجربہ ہر شخص کو ہوگا، محکمۂ ڈاک کی شرحوں میں بھی مسلسل اضافے کے باوجود ڈاک کا وقت سے پہنچنا تو در کنار پہنچ جانا بھی یقینی نہیں ہوتا، ڈاک خانے میں دو شنبے کو عموماً اور ایک دو روز کی چھٹی کے بعد خصوصاً ایک دو دن تک ڈاک نہیں ملتی اور یہ عذر کیا جاتا ہے کہ چھٹی نہیں تھی، جو رسالے ابھی تک ۲۵ اور ۵۰ پیسے کے ٹکٹ لگا کر بھیجے جاتے تھے، ان کی شرح دو روپے کر دی گئی ہے، معارف مسلسل خسارے سے نکل رہا ہے، اب ڈاک کے اضافے کی وجہ سے اس کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے اس لئے اس مہینے یعنی جولائی ۲۰۰۲ء سے اس کا سالانہ چندہ ۱۲۰؍ روپے کر دیا گیا ہے، جس کی ہم کو بھی تکلیف ہے توقع ہے کہ معارف کے خریدار اپنی علم دوستی کی بنا پر اسے گوارا کر لیں گے۔

مقالات

تحریک نقطوی اور دین الٰہی پر اس کے اثرات

از جناب ڈاکٹر محمد معتصم عباسی آزاد صاحب*

(۲)

ان پیشین گوئیوں اور یقین دہانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر واقعی خود کو "مہدی" اور "صاحب زماں" سمجھنے لگا۔ ان پیشین گوئیوں کے مطابق چونکہ اس وقت تک ایران اور ہندوستان میں کسی اور "شیر خدا" یا "امام زماں" نے اپنی آمد کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اکبر کو کامل یقین ہو گیا کہ وہی "امام زماں" ہے۔ اس نے پنجاب میں جہاں شکار کو گیا تھا نندنہ کے مقام پر اپنی "آمد" کا اعلان کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے علاء الملک کی علاء الدین لجی کو تنبیہ کا علم تھا کہ ملک میں وہ فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا کہ "برائے صد بزرجمہر فرو نشیند" لہٰذا حفظ ماتقدم کے طور پر لفظ نبوت کا استعمال نہیں کیا لیکن حقیقتاً دعویٰ نبوت تھا۔ پروفیسر محمد اسلم نے صحیح لکھا ہے کہ ابو الفضل لفظوں کے ہیر پھیر سے اکبر کو کیا سے کیا بنا گیا۔ ملا شیری نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے[۱]:

پادشہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است　　گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

(ہمارے بادشاہ نے اس سال نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ اگلے سال خدا نے چاہا تو خدا ہو جائے گا)

---

[۱] منتخب جلد ۲، ص ۳۰۹۔

---

* جی ۷؍۴۔ سفینہ عباسی، میڈیکل کالج روڈ۔ علی گڑھ۔

انہوں نے اکبر کے دعوی نبوت کو "شورش مغز" قرار دیا تھا۔[۱]

ایک اور شیعہ عالم ملا محمد یزدی جن سے ابوالفضل کی بہت بنتی تھی اور جونپور کے قاضی تھے۔ جب اکبر کے دعوی نبوت کے بارے میں سُنا تو انہوں نے اس کے مرتد ہونے اور اس کے خلاف ہر مسلمان کا تلوار اٹھانا فرض ہونے کا فتوی صادر کر دیا۔ پنجاب کے علماء نے ان کی جرات کی داد دی اور ان کے فتوے کی تائید میں انہوں نے بھی فتوی جاری کیا۔ بنگال کے قاضی یعقوب نے بھی ملا یزدی کی تائید میں فتوی جاری کیا۔ چنانچہ مشرقی اضلاع، بہار اور بنگال میں اکبر کے خلاف بغاوت ہوگئی تھی۔ امراء نے حکیم مرزا کو اکبر کی جگہ تخت سلطنت پر بٹھانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جمعہ کے خطبہ سے اس کا نام نکال کر حکیم مرزا کا نام شامل کر دیا تھا اگرچہ اس بغاوت کو دبانے میں اکبر کامیاب ہوگیا اور ملا محمد یزدی سمیت تمام باغی علماء و امراء کے ہاتھ پیر بندھوا کر دریائے جمنا میں پھینکوا دیا اور دوسرے باغیوں کو قتل کرا دیا[۲] لیکن یہ بغاوت ان معنوں میں کامیاب رہی کہ اکبر کے نورتنوں کی شمع حیات جب باد فنا نے ایک ایک کر کے بجھا دی تو دربار پر راسخ العقیدہ امراء شیخ فرید بخاری، قلیچ خاں، مرزا عزیز کوکلتاش، میران صدر جہاں اور عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ کا قبضہ ہوگیا۔ ان امراء نے عہد کر لیا تھا کہ اسی شہزادے کی حمایت کریں گے جو ملک میں شریعت اسلامی کی بحالی کا وعدہ کرے گا۔ چنانچہ جہانگیر نے اس کا عہد کیا اور ان کی کوششوں سے وہ اکبر کا جانشین ہوا۔ یہ انہیں امراء کے اثرات اور حضرت شیخ

۱؎ منتخب جلد ۲ صفحہ ۳۰۱ - حاشیہ ۳۱ پورا شعر یہ ہے :

مغز ست اگر دید خاطر آرد جا بجا   کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن

۲؎ منتخب جلد ۲ صفحہ ۲۹۶، مغل نوبلٹی ان انڈیا ٹو ۱۶۵۸، محمود علی ۔

مجدد الف ثانی کی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا کہ نور جہاں جو نہ صرف سلطنت کی ملکہ تھی بلکہ جہانگیر کے دل کی بھی ملکہ تھی۔ اسے شیعیت کی طرف اپنی تمام تر کفر سامانیوں کے باوجود مائل نہ کر سکی۔ مستقبل میں پھر کسی مغل حکمراں کو شعائر اسلامی کی مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی۔

بعض ملکی و غیر ملکی مورخین اکبر کے "نئے ظہور" کے دعوے اور نئے مذہب "دین الٰہی" کے بارے میں بدایونی کے بیانات کو تعصب، تنگ نظری اور دشمنی پر محمول کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اکبر کی مذہبی پالیسی کی بنیاد "نظریہ صلح کل" پر تھی[۱] جس کا مقصد ہندوستان میں متحدہ قومیت کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ کچھ لوگ اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کرنے کے لئے اس کا سرا یورپین نشاۃ ثانیہ سے ملاتے ہیں۔ یہ سب ایک گمراہ کن مفروضہ ہے تاریخی حقائق سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اکبر اگر مسلک صلح کل کو اپنا شعار بناتا تو اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ بھی اس کا وہی سلوک ہوتا جو دیگر مذاہب اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ تھا، مسلمانوں کو بھی اپنے دینی شعائر کی ادائیگی کی وہی آزادی ہوتی جو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو تھی لیکن تاریخی حقائق اس کے برعکس شہادت دیتے ہیں اور اکبر کو اسلام دشمن بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے مستند اور معتبر ثبوت و شواہد

۱؎ "نظریہ صلح کل" کے بانی کبیر داس تھے جو اپنے مسلک میں انتہائی مخلص تھے۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات اور اکبر کی تخت نشینی کے درمیان ڈیڑھ سو سالہ عرصہ میں ان کے اس مسلک کو بڑی کامیابی ملی تھی، باہمی رواداری کے جذبے کو فروغ حاصل ہو رہا تھا لیکن اکبر کی نئی مذہبی حکمت عملی سے اس نظریہ کو نقصان پہنچا اس سے دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں بیداری اور شدت پسندی پیدا ہوگئی۔ یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے اور علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی تحریریں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی غربت و بے چارگی اور مسلمانوں کی زبوں حالی اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ خود حضرت مجدد الف ثانی "ظہور مہدی" کے منتظر تھے[1] ایک مکتوب میں وہ تحریر فرماتے ہیں :[2]

"غربت اسلام تا بحدی رسیدہ است کہ کفار بر ملا طعن اسلام و ذم اسلام می نمایند و بی تحاشہ اجرائے احکام کفر و مداحی اہل آں در کوچہ و بازار می گفتند و مسلمانان از اجرائے احکام اسلام ممنوع اند"

ایک اور مکتوب میں بیان کرتے ہیں :

"... مسلمانان از اظہار احکام اسلام عاجز بودند و اگر می کردند بقتل می رسیدند"

خواجہ بدر الدین جو حضرت سلیم چشتی کے صاحب زادے تھے انہوں نے جب اکبر کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ حال دیکھا تو آگرہ سے گجرات منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی انہوں نے جب حالات میں تبدیلی کے کوئی آثار نہیں پائے بلکہ بد سے بدتر ہو گئے تو ایک روز خاموشی سے جہاز میں بیٹھ کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ پھر کبھی واپس نہیں آئے[3] شیخ عبد الحق محدث دہلوی بھی جب حدیث کی سند لینے مکہ معظمہ گئے تھے تو واپسی کا ارادہ ترک کر دیا تھا[4] پروفیسر محمد اسلم لکھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ہمیشہ تک عبد الوہاب متقی کا احسان رہے گا کہ انہوں نے عبد الحق محدث دہلوی کو ہندوستان واپس جانے اور احیائے شریعت کی کوشش کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

[1] دیکھئے مکتوب ربانی: حضرت مجدد الف ثانی، مکتوب ۳۲ [2] ایضاً مکتوب نمبر ۴۶، ۶۵، ۸۱ [3] منتخب جلد ۲ صفحہ ۲۱۳ [4] حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ صفحہ ۱۱۹

اکبر کی مذہبی حکمت عملی اور اسلام سے دشمنی کے بارے میں بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی آواز بازگشت ہمیں اس دور کے شاعروں کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے نظیری نیشاپوری عہد اکبری کا صاحب طرز غزل گو شاعر تھا اور دین دار شخص تھا۔ اکبر کی مذہبی بے راہ روی سے بیزار تھا۔ اسی لئے اکبر نے اس کے بجائے اس سے کمتر درجے کے ایک ملحد شاعر غزالی مشہدی کو اپنا ملک الشعرا بنایا تھا۔ نظیری نے پایہ تخت آگرہ سے دور احمد آباد میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ایک غزل میں اس نے اکبر پر مرموز و ملفوف طنز کیا ہے۔ اس کے یہ دو شعر خصوصیت سے توجہ طلب ہیں :[1]

حسنت تلافی بد ایام می کند
در عہد تو شکایت گردوں نہ کردہ کس

صد توں بر محبت لیلی گذشتہ است
بیداد بر قبیلۂ مجنوں نہ کردہ کس

جب اس طرح بات نہیں بنی تو کھل کر ناصحانہ انداز میں تنقید کی ہے۔ ذرا تیور ملاحظہ ہوں:

گر بہ دل خلوت نداری از جہانبانی گریز
ور تسلط نیستی بر خود ز سلطانی گریز

فتنہ دیو و پری را سر بجانت دادہ اند
اسم اعظم گر نداری از سلیمانی گریز

تا عزیز مصر گردی قبلۂ اخوان شوی
از زلیخا مشربان چون ماہ کنعانی گریز

لاابالی حکمہا راندان چرا بر زیر دست
چند بیباکی زمانی در پشیمانی گریز

مصلحت از عقل برنا جو نہ از نفس فضول
از شب ظلمت بہ سوی صبح نورانی گریز

تا نشان حسن و قبح صورت خویشت دہند
در پناہ آئینہ طبعان روحانی گریز

از مسلمانان نظیری شد مسلمانی خراب
زین مسلمانان بر آور د مسلمانی گریز

اس دور میں اکبر کے درباریوں کی وجہ سے الحاد کا جو رجحان پیدا ہو گیا تھا اس کی

[1] دیوان نظیری نیشاپوری غزلیات ردیف "س" و ردیف "ز"۔

طرف اشارہ کرکے شہزادہ مراد سے کہتا ہے کہ:

طبیعت ہمہ ابنای دہر ملحد شد   ولی ز فطرت تو بر طرف فساد الحی[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب "مدارج النبوۃ" کے بارے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم لکھتے ہیں کہ اس کا محرک اس وقت کے حالات تھے جب حضور ختمی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عوام کا رشتہ ٹوٹ رہا تھا۔ عرفی شیرازی کی نہایت شد و مد کے ساتھ نعت و منقبت گوئی کا محرک بھی وقت اور حالات کا تقاضا سمجھا جانا چاہیئے۔ اکبر عقل کو مدار دین سمجھتا تھا۔ عرفی عشق کی عظمت کا قائل تھا:

"بروای عقل و منہ منطق و حکمت در پیش کہ مرا نسخہ فہمای فلاں در پیش است"[1]

اس کی ایک غزل میں یہ نعتیہ شعر لازوال ہے:[1]

عشق اگر مردست مردی تاب دیدار آورد   ورنہ چوں موسیٰ بسی آورد و بسیار آورد

کس فخر و ناز سے کہہ رہا ہے:

بہ باغ نظم خودمی نازم آخر چوں نہ نازد کس   کہ دارد عطر گیسوی رسول اللہ ریحانش

طالب آملی جسے جہانگیر نے اپنا ملک الشعراء بنایا تھا وہ بھی عقل کو مدار دین سمجھنے اور شریعت سے انحراف کرنے والوں پر تنقید کرتا ہے۔ روئے سخن غالباً اکبر ہی کی طرف ہے:[2]

---

[1] کلیات عرفی شیرازی، غزلیات، ردیف "د"۔ [2] کلیات طالب آملی، غزلیات، ردیف "ل"

نظیری واحد فارسی شاعر تھا جس کے یہاں جہاد کی تلقین ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

مومن نتواں گفتن عاشق کہ مجاہد نیست   رو بوسہ سر بازاں بر طرۂ پرچم زن

یعنی کوئی عاشق رسول یا اسلام اس وقت تک مومن نہیں کہا جا سکتا جب تک رسول

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱ پر)

کم فروغ خرد گیر و نور شرع پذیر   کہ آفتاب شریعت بہ از ستارہ عقل

گہی بمشورت شرع نیز می کن کار   تمام عمر مرو رہ بہ استخارہ عقل

عروج پایہ معراج مصطفیٰ بنگر   یکی بعذر فرو آ ازیں منارہ عقل

بحرف شرع گہی گوش میدہ ازرہ ہوش   مدار چشم شب و روز بر اشارہ عقل

بہ بزم شرع چو ایمانیان درآ طالب   مکن ز دور چوں یونانیاں نظارہ عقل

ان خارجی شہادتوں کو ناقابل یقین مان بھی لیا جائے تو داخلی شہادتوں کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے جن سے بدایونی کے بیانات کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تصدیق ہوتی ہے۔ اکبر کی فرمائش پر بدایونی نے مہابھارت کا ترجمہ کیا تھا۔ اس پر چھتیس صفحہ کا ابوالفضل نے دیباچہ تحریر کیا تھا جسے بدایونی "الکفریات والحشویات" کہتا ہے۔[1] اسی دیباچے میں ابوالفضل نے اکبر کے لئے جس طرح کے القاب وضع کئے ہیں مثلاً "سلطان عادل و برہان کامل"، "دلیل قاطع خدادانی و حجت رحمت روحانی"، "قافلہ سالار حقیقی و مجازی"، "پیشوائے خداشناساں و مقتدائے بدی اساساں"، "قبلہ خدا آگاہاں"، "پردہ برانداز اسرار غیبی و چہرہ گشائے صورت لاریبی"، "قاسم ارزاق بندگان الٰہی"، "ہادی علی الاطلاق و مہدی استحقاق"[2] یہ سب ایسے نبوت کی صفات سے متصف کرنے والے القاب ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰) کی حرمت اور اسلام کی عظمت کے لئے ایک مجاہد کا سا جذبہ نہ ہو۔ اگر مومن ہونے کا دعویٰ ہے تو جاؤ پہلے سربازوں کی طرح طرہ پرچم کو بوسہ دو یعنی میدان جہاد میں اس کا ثبوت پیش کرو۔

اسی طرح عرفی کے جذبہ عشق کی اقبال نے تعریف کی:

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے   تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی   میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشک عنابی[1]

[1] منتخب جلد ۲ ص ۳۱۲ [2] دیباچہ مہابھارت ص ص ۲۶، ۱۴، ۶، ۵۔

اس نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ لکھ کر اکبر کو "برگزیدہ الٰہی"، "یگانہ درگاہ حمدیت"، "یگانہ بساط احدیت"، "یکتائے خلوت کدہ نور"، "زبدہ نتائج عناصر و اجرام"، "خلاصۂ آفرینش" اور "خلیفۃ اللہ" لکھا ہے[1]۔ وہ اس نئے دین کا نام بھی "نو آئین الٰہی" لکھتا ہے[2] جس کا نزول اکبر پر ہوا تھا۔ بدایونی اسے کہیں "توحید الٰہی" اور کہیں "دین الٰہی" لکھتا ہے۔ محسن فانی نے "دبستان مذاہب" میں "دین الٰہی" کا ایک علحدہ دین کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

اکبر کو اسلام اور شعائر اسلام ہی سے دشمنی نہیں تھی بلکہ اسے بانی اسلام سے بھی کدورت تھی[3]۔ اسے ان کا نام لینا بھی ناگوار تھا۔ احمد، محمد، مصطفیٰ، محمود جیسے نام اسے سخت ناپسند تھے۔ اگر یہ نام کسی کے نام کا جزو ہوتے تو وہ اسے دوسرے ناموں سے مخاطب کرتا تھا جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خود کو نبی اور ایک نئے دین کا بانی سمجھتا تھا۔ وہ اسلامی تاریخ کو بھی مسخ کرا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کی ہزار سالہ مدت ختم ہو چکی اور ایک نئے دور اور نئے ظہور کا آغاز ہے اس نے "تاریخ الفی" لکھے جانے کا حکم دیا تو جن سات لوگوں کو اس کام کے لئے منتخب کیا تھا ان میں بدایونی بھی تھا۔ اس کا بیان ہے کہ جب اس نے "تعمیر کوفہ"، "ہدم قصر الامارۃ"، "تعین اوقات صلوٰۃ خمسہ"، "فتح نصیبین" اور حضرت ام کلثوم سے حضرت عمرؓ کے نکاح کے واقعات لکھ کر اکبر کو پیش کیا تو وہ اس قدر برافروختہ ہوا کہ ابوالفضل کی مداخلت پر اپنی جان بچا سکا[4]۔ بدایونی کے اس بیان سے پروفیسر محمد اسلم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اکبر اسلامی تاریخ شیعہ نظریہ کے مطابق از سر نو لکھوانا چاہتا تھا۔ کیونکہ بعد میں ان واقعات کو اس نے ایک غالی شیعہ

---

[1] دیباچہ مہابھارت ص ۳۶، [2] اکبرنامہ، [3] آئین اکبری، جلد ۳، ص ۲۵۳، [4] تفصیل کے لئے دیکھئے "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" ص ۱۹۹ تا ص ۲۰۰، [5] منتخب جلد ۲ ص ۱۸۰۔

احمد ٹھٹھوی سے لکھوایا تھا[1]۔

ملا شیری اور ملا یزدی شیعہ تھے اور اکبر اور ابوالفضل سے قریب تھے۔ ملا شیری کو جب یہ معلوم ہوا کہ اکبر سنسکرت کے ہزار الفاظ جپتا تھا تو اس نے ان الفاظ کو اس کے لئے منظوم کر دیا تھا[2]۔ اسی طرح ملا محمد یزدی کے بارے میں بدایونی کا بیان ہے کہ بر سر دربار خلفائے ثلاثہ کو "ناسزائے قبیح" و "طعن صریح" کہا کرتے تھے اور عام صحابۂ کبار و "تابعین و تبع تابعین"، "سلف و خلف صالحین" کی تکفیر و تفسیق کیا کرتے تھے اور سوائے مذہب شیعہ کے تمام مذاہب کو "ضال و مضال" بتاتے تھے[3]۔ ایک کا اکبر پر شعر میں طنز اور اس کے دعوے کو "شورش مغز" بتانا اور دوسرے کا اکبر پر ارتداد اور اس کے خلاف تلوار اٹھانے کا فتوی بے بنیاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ جب تک امامت اور مہدویت تک محدود رہا ان کے لئے قابل اعتراض نہ تھا۔ لیکن جب نبوت کے دعوے تک پہنچ گیا تو وہ اس کے خلاف ہو گئے۔

ان داخلی اور خارجی شہادتوں کی موجودگی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اکبر مرتد ہو چکا تھا اور نقطویوں کی طرح وہ بھی اسلام دشمن تھا۔ محمود پسیخانی کی طرح خود کو "نیا ظہور" سمجھتا تھا اور شعائر اسلام کو مٹا دینا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے بھی محمود پسیخانی کی طرح نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور ایک نئے دین کی بنیاد رکھی تھی۔ اس دین کی بنیاد میں

---

[1] منتخب جلد ۲ ص ۱۹، [2] ایضاً ص ۳۲۶ - ۳۲۲، [3] ایضاً ص ۲۵۹، "طعن صریح و ناسزای قبیح بر خلفای ثلٰثہ و تکفیر و تفسیق عامۂ صحابۂ کبار و تابعین و تبع تابعین و سلف و خلف صالحین از متقدمین و متاخرین رضی اللہ عنہم کردہ اہل سنت و جماعت را محقر و مہان در نظر نمودن گرفت و غیر از مذہب شیعہ ہمہ را ضال و مضال دانائید۔"

تحریک نقطوی کا کتنا حصہ ہے اس کا جائزہ لینے کے لئے ذیل میں دونوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ نقطویوں کا عقیدہ تھا کہ انسانی اجزا مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتے رہے ہیں۔ ان کا ہر قدم کمال کی طرف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ "مرتبہ محمدی" آگیا۔ ایک ہزار سال کی مدت میں یہ قدم مزید کمال کی طرف بڑھا اور "درجہ محمودی" آیا۔ یہی عقیدہ اکبر کے دعوی نبوت کا جواز بنا کیونکہ اس عقیدے کی رو سے کمال کی طرف بڑھنے والے ہر قدم کا سفر رکا نہیں جاری رہا۔

۲۔ نقطویوں کا عقیدہ تھا کہ ہر چیز کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے۔ وہ خاک کو نقطہ مانتے تھے۔ اکبر بھی آگ کو "ام عناصر" مانتا تھا اور اس کی پرستش کرتا تھا[۱]

۳۔ نقطوی عقلیات کے قائل تھے۔ نقلیات کے منکر تھے۔ اکبر بھی عقل کو مدار دین سمجھتا تھا۔ علوم نقلیہ کی تعلیم کی ممانعت کردی تھی[۲]

۴۔ نقطوی کواکب کی تاثیر کے قائل تھے۔ اکبر بھی ان کی تاثیر کا قائل تھا۔ اس نے دیوی برہمن سے تسخیر کواکب کا عمل سیکھ لیا تھا[۳]

۵۔ نقطوی انسان کو حق کا مترادف سمجھتے تھے اور اس کی پرستش کے قائل تھے راجہ ٹوڈر مل بغیر پوجا پاٹ کئے نہ مسواک کرتا تھا نہ کچھ کھاتا تھا۔ ایک سفر میں اس کے ٹھاکر (بت) غائب ہوگئے۔ اس نے کھانا پینا اور سارا کام چھوڑ رکھا تھا۔ اکبر کو معلوم ہوا تو اس نے اس سے کہلوایا کہ میں موجود ہوں میرا درشن کر کے بھوجن کر لو[۴]

۱؎ مہابھارت ص ۱۲۵ ۲؎ منتخب جلد ۲ ص ۲۱۲۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جن مسائل کا تعلق عقل سے ہو مجھ سے پوچھا کرو جس کا شریعت سے ہو ملاؤں سے پوچھو۔ ۳؎ ایضاً ص ۲۶۰ ۴؎ دربار اکبری ص ۳۵۲۔

۶۔ نقطویوں کا تناسخ پر عقیدہ تھا۔ وہ حشر و نشر کے منکر تھے۔ اکبر بھی تناسخ کا قائل تھا۔ اس کے بغیر ثواب و عذاب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا[۱]

۷۔ نقطوی سورج کی طرف رخ کرکے ایک مخصوص دعا پڑھتے تھے۔ اکبر بھی سورج کی طرف منھ کرکے سنسکرت کے ہزار الفاظ جپتا تھا[۲]

۸۔ نقطوی غسل جنابت کے قائل نہیں تھے۔ اکبر نے بھی غسل جنابت منسوخ کردیا تھا[۳]

۹۔ نقطوی قرآن مجید کو حضورؐ کی تصنیف بتاتے تھے۔ اکبر بھی قرآن مجید کو حضورؐ کی تصنیف مانتا تھا۔ جہانگیر کو ابوالفضل سے شکایت تھی کہ اس قرآن کا حضورؐ کی تصنیف ہونا اس کے والد کے ذہن نشین کردیا تھا[۴]

۱۰۔ نقطوی شعائر اسلامی کو اہل الرائے کا وضع کردہ بتاتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اکبر بھی نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کو نہیں مانتا تھا۔ ان پر پابندی عائد کردی تھی[۵]

۱۱۔ نقطویوں کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی مدت ایک ہزار سال تھی جو ختم ہوگئی۔ اب نئے دور، "نئے ظہور" اور نئے دین کا آغاز ہے۔ عربوں کی سیادت ختم ہوگئی۔ اب عجمیوں کا دور ہے۔ اکبر بھی اس کا قائل تھا۔ فیضی کے قصیدے میں اس نئے دور کی خوشخبری ہے[۶]

فرخندہ باد یا رب بر مملکت ستانی ‏ ‏ ‏ ‏ از مبدا ر خلافت آغاز قرن ثانی"

اسلام کے ہزار سالہ دور کے ختم ہونے کے ثبوت کے طور پر اس نے "تاریخ الفی" لکھوائی تھی۔

۱۲۔ نقطویوں کا کہنا تھا کہ عربوں کا دور ختم ہوگیا اب عجمیوں کا دور ہے جو آٹھ ہزار سال تک رہے گا۔ پیغمبر ان میں پیدا ہوں گے۔ اکبر بھی خود کو عجمیوں سے وابستہ کرنے کے لیے

۱؎ منتخب جلد ۲ ص ۲۰۶ ۲؎ ایضاً ص ۳۲۲ ۳؎ ایضاً ص ۳۰۵ ۴؎ مآثر الامراء جلد ۲ ص ۳۱۶ ۵؎ مبلغ الرجال ورق ۲۵ ۶؎ کلیات فیضی، قصائد، ردیف "ی"۔

نہ صرف حضورؐ کی ذات مبارک سے دشمنی رکھتا تھا بلکہ عربی زبان، عربی حروف، عربی ناموں سے بھی نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے سن ہجری کو بھی شمسی میں بدل دیا تھا، مہینوں کا تعین بھی عجمی بادشاہوں کے طریقے پر کر دیا تھا۔ زرتشتیوں کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کیں تھیں۔ "شاہنامہ فردوسی" کے یہ دو شعر اسے بہت پسند تھے:

زشیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائی رسید ست کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو	تفو بر تو ای چرخ گرداں تفو

انہیں سند بنائے ہوئے تھا۔ اپنے پوتوں کا نام ساسانی بادشاہوں کے نام پر رکھتا تھا[1]

۱۳۔ نقطویوں کا کلمہ "لا الٰہ الا المرکبین" تھا۔ "دین الٰہی" کا کلمہ بھی لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تھا[2]

۱۴۔ نقطوی محمود پسیخانی کو "انسان کامل" سمجھتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔ ابوالفضل اکبر کو بھی انسان کامل بتاتا ہے اور "دین الٰہی" کے ماننے والے اس کا "درشن" کیا کرتے تھے[3]

۱۵۔ نقطوی ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر سلام مسنونہ کی جگہ "اللہ اللہ" کہتے تھے۔ "دین الٰہی" کے ماننے والے بھی "اللہ اکبر" اور جواب میں "جل جلالہ" کہتے تھے[4]

اگر دستیاب ماخذوں پر مزید تحقیق و تدقیق کی جائے تو کچھ اور حقائق کے منکشف ہونے کے امکانات ہیں۔ جن ماخذوں کے حوالے دئے گئے ہیں ان کے

[1] منتخب جلد ۲- ص ۳۰۵ [2] ص ۳۳۵ [3] ایضاً ص ۲۰۳ [4] دیکھئے: آئین اکبری، باب "آئین رہنمونی" [5] آئین اکبری، جلد ۱ ص ۱۹۳ ـ

مطالعہ سے راقم الحروف اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ "دین الٰہی" کی تشکیل میں نقطوی تحریک کا حصہ نہیں ہے بلکہ بنیاد ہے۔ البتہ دوسرے مذاہب خصوصاً ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے ان کے بھی کچھ عقائد اور رسوم اس میں شامل کر لئے گئے تھے۔ شاہ عباس صفوی نے ایران سے نقطوی تحریک کو ختم کر دیا تھا۔ شریف آملی ابوالفضل کے ساتھ مل کر اسے اکبر کے ذریعہ ہندوستان میں زندہ کرنا چاہتا تھا[1]۔ پروفیسر محمد اسلم مرحوم (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے) نے "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" لکھ کر یورپین اور آزاد خیال ہندوستانی مورخوں کی "دین الٰہی" اور اکبر کی مذہبی حکمت عملی کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔ پھر بھی اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

[1] بدایونی اور خواجہ کلاں دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ابوالفضل کو گمراہ کرنے والا شریف آملی تھا اور بقول اسکندر منشی اکبر کو جادہ شریعت سے منحرف کرنے والا ابوالفضل تھا (مبلغ الرجال، ورق ۳۲ الف)، (تاریخ عالم آرای عباسی، جلد ۲ ص ۳۲۵ ـ

عرب جاہلیت کی معاشرت کی ایک جھلک

از ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحب ٭

عہد جاہلیت میں[1] جزیرہ نمائے عرب کے لوگ اپنی طرزِ معیشت و معاشرت کے لحاظ سے دو حصوں میں منقسم تھے۔[2]

۱۔ حضری (یعنی اہل المدر) ۲۔ بدوی (یعنی اہل الوبر)

طرزِ معاشرت کے اس تفاوت کی وجہ ان کے مختلف ذرائعِ معاش اور مختلف وسائلِ حیات

---

[1] یہاں عہدِ جاہلیت سے مراد ہے دعوتِ اسلام سے پہلے خصوصاً ہجرتِ نبویؐ سے پہلے کا زمانہ کیونکہ اس عہد کے جزیرۃ العرب میں مشرکین عرب کا اجتماعی و سیاسی قانون موثر تھا جو کسی وحی یا الہام کے تابع نہیں تھا۔ اسی لئے وہ زمانہ جہل و ہویٰ کا زمانہ تھا۔ جہل سے مراد لاعلمی کے علاوہ درشتی، سختی، بربریت، خشونت، اکھڑپن اور قوانین الٰہیہ اور خدا سے ناواقفیت اور حالتِ کفر و بت پرستی بھی ہے۔ مشہور جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم نے بھی اپنے معلقہ میں لفظ "جہل" درشتی کے معنوں میں استعمال کیا ہے ع فنجہل فوق جہل الجاہلینا

(ہم اکھڑ لوگوں سے بھی بڑھ کر سختی اور درشتی سے پیش آئیں گے) جہل کی ضد علم بھی ہے اور حلم بھی (الزمخشری، محمود بن عمر (م ۵۳۸ھ) الکشاف، مطبعۃ الاستقامۃ، قاہرہ ۱۹۳۶ء طبع اول جلد ۳ ص ۵۳۵، ۵۳۶ [2] مقدمہ: علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) دار صادر بیروت، ص ۱۰۱۔

٭ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی۔ کراچی۔

تھے۔ عربوں کے ایک گروہ کا پیشہ زراعت تھا۔ اس کی وجہ سے وہ مجبور تھے کہ جب تک فصلیں تیار نہ ہوجائیں وہ ایک ہی جگہ قیام کریں۔ وہ گاؤں آباد کر کے وہاں مقیم ہوجاتے۔ حضری گروہ بدویوں کی نسبت کم تعداد میں تھا۔ اسی لئے جزیرہ نمائے عرب میں شہروں کی تعداد بھی کم تھی۔ یہ بات صرف وہیں سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جہاں بھی بدویت ہوگی وہاں شہروں کی تعداد کم ہوگی۔ عہدِ حاضر میں المغرب اور مشرقی افریقہ میں بھی شہروں کی کمی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہاں کے باشندے اہل البادیہ ہیں۔ اگرچہ سرزمین عرب وسیع صحراؤں اور سنگلاخ پہاڑوں پر مشتمل تھی۔ پھر بھی کہیں کہیں قابلِ کاشت زمینیں بھی تھیں۔ ساحلی مقامات خصوصاً سرسبز و شاداب تھے۔ مثلاً یمن، عمان، حضرموت وغیرہ، اس کے علاوہ نجد، خیبر اور حجاز میں طائف اور مدینہ وہ علاقے تھے جہاں زراعت ہوتی تھی۔

عربوں کے دوسرے گروہ کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ یہ اہل البادیہ تھے جو خانہ بدوشی کے لئے مجبور تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے مویشیوں کے لئے نئی چراگاہوں اور نئے چشموں کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا تھا۔ یہ کثیر التعداد تھے۔ ان اہل البادیہ کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو صرف اونٹوں کو پالتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ جو بھیڑ بکریاں وغیرہ پر زندگی بسر کرتا تھا۔

اصل میں بدوی وہی تھے جو اونٹوں کو پالتے تھے۔ اونٹ کے لئے صحرا موزوں ترین جگہ ہے۔ اسے پیاس برداشت کرلینے کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے اور وہ طویل مسافت کو بہت تیزی سے طے کرسکتا ہے اور یہ بات بھی یقینی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ بدوی عربوں کی قبائلی جنگوں میں اونٹ کو گھوڑے پر برتری حاصل ہوتی ہوگی۔ کیونکہ طویل مسافتوں میں سواری کے اونٹوں کی رفتار گھوڑوں سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ گھوڑوں کے مقابلے میں زیادہ بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ بہرحال عربوں کی بدوی زندگی اونٹ پالنے پر منحصر تھی۔ اس کی وجہ سے

اہل البادیہ کے لئے صحرائی زندگی بڑی سازگار اور مناسب ہوگئی تھی کیونکہ صرف پہاڑوں کی پیداوار اونٹوں کی پرورش کے لئے کافی اور مفید نہیں ہوسکتی تھی اس لئے یہ لوگ مجبور تھے کہ صحرا کے اندر نفوذ کرکے نہ صرف وہاں کے خس وخار سے اونٹوں کو ان کی طبعی غذا مہیا کریں بلکہ کھاری پانی بھی انہیں پلائیں جس پر اونٹوں کی صحت وعافیت کا انحصار تھا۔ پھر چونکہ اونٹ سردی کی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا اس لئے موسم سرما میں اس گروہ کے لئے اور بھی ضروری ہوجاتا تھا کہ وہ سرسبز و آباد مقامات کو چھوڑ کر ریگستانوں اور صحراؤں کی راہ لیں۔ علامہ ابن خلدون نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ریتیلے اور ریگستانی علاقوں میں اونٹنی آسانی سے بچے دے دیتی ہے۔ دراصل اس کے بچے بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی پیدائش کے وقت اونٹنی کو گرم ماحول کی سخت ضرورت ہوتی ہے[1]

یہ اہل البادیہ حضارت و مدنیت سے ناآشنا ہوتے تھے اور شہروں اور قصبوں کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہیں غلام سمجھتے تھے۔ انہیں اپنی یہ آزادی انتہائی عزیز تھی۔ ان کے نزدیک کسی خاص مقام کو مسکن بنانا گویا آزادی کو خیرباد کہنا تھا۔ کیونکہ جہاں مسکن معین ہو وہاں غیر کا محکوم ہونا بھی لازمی ہے[2]

یہ بدوی کبھی مفتوح نہیں ہوئے۔ چنانچہ اس زمانے میں ختیقیہ اور فلسطین کے لوگ خراج ایران کے بادشاہوں کے باجگزار تھے۔ اس وقت بھی یہ عرب خراج سے مستثنیٰ تھے[3] ان کے پڑوس میں دو بڑی مملکتوں کی موجودگی کے باوجود انہیں کوئی فتح نہ کرسکا۔ ان میں وحشت و صحرائیت کا عنصر زیادہ تھا اور وہ جنگجویانہ اوصاف کے حامل تھے۔ اسلحہ کا استعمال ان کا دلچسپ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص۱۰۱ [2] تمدن عرب، موسیو گستاولیبان (مترجم سید علی بلگرامی) لاہور، مقبول اکیڈمی ص۱۰۱ [3] ایضاً ص۱۰۲۔

کا مشغلہ تھا۔ ریگستانی راہوں پر قافلوں اور مسافروں کو لوٹ لینا ان کی معاشی مجبوری تھی۔ وہ آرام و آسائش کی متمدن زندگی سے آشنا ہی نہیں تھے۔ ان کی معاشرت میں حیرت انگیز سادگی تھی۔ وہ خیموں میں زندگی گزارتے اور پانی اور چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔ لوٹ مار اور غارت گری کرکے رزق حاصل کرتے اور اسی پر گزر اوقات کرتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کی آبادی کا غالب حصہ انہی بدوی قبائل پر مشتمل تھا۔ جو عرب کے طبعی حالات کا اقتضا تھا۔ کیونکہ ایک ایسا ملک جو وسیع صحراؤں، بے آب وگیاہ ریگستانوں اور طویل کوہستانی سلسلوں پر مشتمل ہو، جہاں کوئی دریا نہ ہو، جس کے گرد منظم بستیاں بسائی جاسکیں اور زراعت کی جاسکے۔ وہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا ذریعہ معاش گلہ بانی ہی ہوگا اور وہاں کے لوگ چارے اور پانی کی تلاش میں خانہ بدوش رہیں گے۔

تاہم یہ طرزِ معاشرت پورے جزیرۃ العرب کا نہیں تھا۔ عرب کے بعض علاقے نہایت متمدن اور ایک منظم ضابطہ حیات کے پابند تھے۔ اس ضمن میں سرفہرست یمن تھا[1] جو ایک

---

[1] عرب قدیم کا سب سے متمدن اور سرسبز خطہ یمن تھا جو جزیرۃ العرب کے جنوب میں واقع ہے۔ "وقتاً فوقتاً یہاں عمالیق، اہل معین، عاد، سبا اور حمیر کی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں جنھوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنائیں جن کی عظمت کے نشان آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اہل یمن کے تجارتی تعلقات اہل ہند، ایران اور حبشہ کے ساتھ قائم تھے۔ یہاں ظہورِ اسلام سے صدیوں پہلے آل سبا کی حکومت قائم ہوئی اس کے بعد انہی کی نسل آل حمیر حکمراں ہوئی۔ یمن کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ۵۲۵ء میں اہل حبشہ کے تسلط سے ہوا جن کی حکومت تقریباً ۵۰ سال تک رہی۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایرانیوں نے حبشیوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا اور ظہور اسلام تک یمن ایرانی سلطنت کا ایک حصہ رہا (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، عبدالملک (م ۲۱۳ھ) مصر، مصطفےٰ (بقیہ حاشیہ ص۲۲ پر)

درخشاں تہذیب کا حامل تھا۔ اس کے حکمرانوں نے وسیع سلطنتیں قائم کیں۔ جزیرہ نما کے باہر بحیرہ احمر کے دوسرے ساحل پر حبشہ میں اپنی نوآبادی کی بنیاد رکھی اور اندرونِ ملک پہاڑوں کے درمیان مارب[۱] کے مقام پر بند باندھ کر یمن کے ایک معتدبہ علاقے کو قابلِ کاشت بنادیا۔ جنوبی عرب یعنی یمن اور حضر موت کی خوش حالی کا دارومدار زراعت اور

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱) بابی حلبی ۱۳۵۵ھ جلد ا ص ۱۳ تا ص ۲، نیز تاریخ ارض القرآن، ندوی، سید سلیمان، کراچی، مجلس نشریات اسلام، جلد ا ص ۲۳۹ تا ص ۲۹۳۔

[۱] اہل یمن نے زراعت کی ترقی کے لئے وادیوں میں بارش کے پانی کو روک کر بڑے بڑے بند بنائے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور سد مارب تھا، جس کا قرآن میں بھی ذکر ہوا ہے (سورۂ سبا: آیات ۱۵-۱۹) شہر مارب کے جنوب میں دو پہاڑ ہیں جنھیں کوہ ابلق کہا جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں کے بیچ میں وادی اذنیہ ہے۔ پہاڑوں سے نیز ادھر اُدھر سے پانی جمع ہوکر وادی میں ایک دریا سا جاری ہوجاتا ہے۔ سبانے ان پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق۔م میں سد مارب کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند تقریباً ۱۵۰ فٹ لمبی اور ۵۰ فٹ چوڑی ایک دیوار تھی۔ اس بند میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں۔ جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں، بند کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہوکر چپ وراست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ قدیم مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ایام حمیر تک یہ بند صحیح سلامت رہا۔ بعد میں جب ملک میں سیاسی انتشار پھیلا اور بند کی نگرانی کی طرف سے غفلت برتی گئی تو یہ بند بتدریج تباہ ہوگیا۔ اس بند کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے۔ بقول حمزہ اصفہانی ظہور اسلام سے چار سو سال قبل یہ بند تباہ ہوا۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ یمن پر حبشیوں کے تسلط کے زمانے یعنی چھٹی صدی عیسوی میں یہ بند تباہ ہوا اور ابن خلدون کا خیال ہے کہ بند کی تباہی پانچویں صدی عیسوی میں مکمل ہوئی (بقیہ حاشیہ ص ۲۳ پر)

تجارت پر تھا۔ صدیوں تک یہاں کے تاجروں کی تجارت پر اجارہ داری رہی اور وہ ہندوستان اور یورپی ممالک کے درمیان آمد و رفت کے ذرائع پر بھی متصرف رہے۔ یہ لوگ اپنا تجارتی سامان خشکی کے راستوں سے بھیجتے تھے جو عرب کو جنوب سے شمال تک قطع کرتے تھے۔ شمالی عرب میں بھی نوآبادیاں قائم کرلی گئی تھیں اور مصر اور خلیج فارس کے علاقوں میں بھی تجارتی سرگرمیوں کی شہادت ملتی ہے۔

جنوبی عرب خصوصاً یمن میں تمدنی ترقی عروج پر تھی۔ بہت سی شاندار عمارتوں کا پتہ چلتا ہے، جس میں قصر غمدان کا تذکرہ بڑے طلسماتی انداز میں کیا گیا ہے۔ یہاں ملنے والے کتبے اس بات کی بھی شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے۔ ان کا سیاسی نظام انتہائی مستحکم تھا۔

جنوب میں صرف یمن کی حکومت ہی متمدن نہیں تھی بلکہ شمالی علاقوں میں بھی تہذیب وتمدن کی سرگرمیاں ملتی ہیں۔ عراق کی سرحد پر حیرہ[۱] میں مناذرہ (آل لخم) کی حکومت قائم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲) (العرب قبل الاسلام، جرجی زیدان، مصر، طبع دار الہلال ۱۹۰۸ء جلد ا ص ۱۵۰ تا ص ۱۶۱۔ نیز ارض القرآن، ندوی، سید سلیمان، جلد اول ص ۲۵۴)

[۱] یہ عراق عرب میں قائم عربوں کی نیم خود مختار حکومت تھی۔ ایرانی بادشاہ شاپور اول کے عہد (سنہ ۲۴۰ء) میں حکومت ایران نے نہر فرات کے کنارے حیرہ کی مملکت کی بنیاد رکھ کر عمرو بن عدی کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔ یہ ایک طرح کی بفر اسٹیٹ تھی۔ حیرہ کی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ایران پر اس کی سمت سے حملہ آوروں کی مدافعت کرے۔ اس کے عوض ایران نے اسے ٹیکس کی ادائیگی سے معافی دے رکھی تھی۔ ایرانی حکومت عموماً حیرہ کے عربوں پر بنو قضاعہ کی ایک شاخ قبیلہ لخم کے کسی فرد کو مقرر کرتی تھی، اسی لئے اس کو آل لخم یا لخمی حکومت (بقیہ حاشیہ ص ۲۴ پر)

تھی جو بحرین پر بھی برائے نام تسلط کی دعویدار تھی۔ عربوں کی یہ حکومت ایرانیوں کی طفیلی ریاست تھی۔ یہ شہر تمدن کے ایک معیار تک پہنچ گیا تھا اور آراستگی اور خوبی میں دارالسلطنت ایران اور قسطنطنیہ کا مقابلہ کرتا تھا[۱] بادشاہوں کے دربار میں شعراء جمع رہتے۔ روایتوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حیرہ کا شہر عالی شان محلوں، شاداب باغوں اور نظر فریب نہروں کی وجہ سے اس عہد کا بارونق شہر سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح شام کی سرحد پر غساسنہ[۲] (آل جفنہ) کی حکومت رومیوں کے زیر اثر

(بقیہ حاشیہ ص ۲۳) بھی کہتے ہیں۔ پایہ تخت حیرہ کی مناسبت سے ملوک حیرہ اور متعدد حکمرانوں کے نام منذر ہونے کی وجہ سے "مناذرہ" کی حکومت بھی کہتے ہیں۔ حیرہ پر مناذرہ کے بائیس بادشاہوں نے تین سو چونسٹھ سال تک حکومت کی۔ قبیلہ لخم کی امارت کا نظام بوجوہ سنہ ۶۰۲ء میں ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہاں ایرانی حکومت اپنی طرف سے ایرانی گورنر مقرر کرتی تھی جس کی اطاعت حیرہ کے تمام امرائے عرب کیا کرتے تھے۔ یہ دستور ۶۳۳ء تک باقی رہا جس کے بعد حیرہ کو حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا تھا (فجر الاسلام احمد امین المصری، قاہرہ لجنۃ التالیف والنشر سنہ ۱۹۶۵ء، الطبعۃ العاشرۃ ص ۱۰)

[۱] تمدن عرب ص ۱۹۶ [۲] ابوالفداء کے بیان کے مطابق یہ حکومت تیسری صدی عیسوی میں وجود میں آئی اور اس کا خاتمہ سنہ ۶۳۳ء میں عہد فاروقی میں ہوا۔ یوں آل غسان کے حکمرانوں نے کم و بیش چار سو سال حکومت کی۔ ان حکمرانوں نے رومیوں کے زیر اثر عیسائیت اختیار کر لی تھی، اس کو غساسنہ کی حکومت اس لئے کہتے ہیں کہ یمن سے ہجرت کے بعد یہ لوگ تہامہ میں نہر غسان کے کنارے آباد ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے وہ غسان کے نام سے معروف ہوئے۔ انہیں شاہی خاندان کے نام سے آل جفنہ بھی کہتے ہیں (تاریخ ارض القرآن جلد ۲ ص ۳۱۳) (بقیہ حاشیہ ص ۲۵ پر)

قائم تھی۔ قحطان کی ایک شاخ کہلان کے عربوں کی تھی۔ یہ ایک نیم خود مختار حکومت تھی۔ جس کا پایہ تخت بصریٰ کا شہر تھا۔ یہ حکومت حوران اور بلقاء کے دونوں منطقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنے وقت کی خاصی متمدن حکومت تھی۔ آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات نے ان کی ترقی و تمدنی عظمت کو ثابت کر دیا ہے۔

تاہم عموماً شمالی اور جنوبی عرب کی ان متمدن ریاستوں کا کوئی خاص اثر وسطی عرب پر نہیں تھا۔ وسطی عرب کے بیشتر باشندے بدویانہ نظام زندگی کے خوگر تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی، وسطی اور جنوبی عرب میں جن میں سرحدی اتصال تھا تہذیب و تمدن کا اتنا واضح فرق کیوں نظر آتا ہے؟

میرے نزدیک اس کی سب سے قوی وجہ ان علاقوں کے مختلف جغرافیائی حالات و عوامل ہیں۔ کسی جگہ کی تہذیب و تمدن کے تشکیلی عناصر میں جغرافیائی عامل کو بہت طاقتور سمجھا جاتا ہے۔ یہ انسانی خدوخال سے لے کر طرز معاشرت و معیشت تک ہر معاملہ میں موثر ہوتا ہے۔ وسطی عرب کے ریگستانی علاقوں کے عربوں کا گلہ بان ہونا اور شمالی یا جنوبی عرب کے رہنے والوں کا اہل زراعت و تجارت ہونا ان کی اپنی پسند یا صوابدید پر منحصر نہیں تھا۔ بلکہ یہ وہاں کے جغرافیائی حالات کا اثر تھا کہ وہ جہد للبقاء کے لئے ایسا کرنے پر مجبور ہوئے۔

بہر حال جزیرۃ العرب کی خواہ حضری آبادی ہو یا اہل البادیہ ہوں ان کا طرز زندگی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴) غسانیوں کا آخری فرمانروا جبلہ بن ایہم تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں شام کی فتح کے دوران یہ مسلمان ہو گیا بعد میں مسلمانوں کے جذبہ مساوات کی تاب نہ لاتے ہوئے مدینہ سے بھاگ کر قیصر کے پاس چلا گیا اور قسطنطنیہ میں ہی سنہ ۲۰ھ میں فوت ہوا۔

قبائلی تھا۔ عہد جاہلیت کا سب سے اہم معاشرتی ادارہ "قبیلہ" تھا۔ قبیلہ ہی وہ وحدت تھی جس پر عربوں کی اجتماعی زندگی کا دار و مدار تھا۔ حضری عرب بھی اسی قبائلی طرزِ زندگی کے عادی تھے۔ یہ درست ہے کہ مکہ میں قصی بن کلاب[1] کے بعد ایک سیاسی نظام نظر آتا ہے ان کا پیشہ تجارت تھا۔ ان کے تاجر حبشہ، عراق، ایران، شام بلکہ ایشیائے کوچک تک جاتے

[1] مکہ کی شہری ریاست کی بنیاد قصی بن کلاب نے ڈالی اور اسی سے قریش کی حقیقی عظمت کا آغاز ہوتا ہے۔ قصی نے قبائل قریش کو منظم کیا، مکہ سے بنو خزاعہ کو نکال کر شیعہ میں قریش کی بستیاں بسائیں۔ اس نے مکہ میں جس یونانی طرز کی شہری ریاست کی بنیاد رکھی تھی اس کے چودہ عہدوں کی سربراہی دس بطون قریش میں منقسم تھی۔ خود قصی کی حیثیت رئیسِ اعلیٰ کی تھی۔ اس ریاست کا ایوانِ حکومت کعبہ سے متصل دار الندوہ کی عمارت میں تھا۔ یہ شہری ریاست اپنے عہد کی ایک متمدن ریاست تھی اور قریش کی نسبتاً ترقی یافتہ سوسائٹی کی خبر دیتی تھی۔ دراصل قصی نے حدود شام میں تربیت پائی تھی۔ قریشی عرب اس وقت تک بدوی تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے تہذیب زندگی، نظم حکومت اور تاسیس قومیت کے اصول شام کے ملک سے سیکھے اور حجاز آکر اسی اصول پر ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی بلکہ پروفیسر حمید اللہ، ابن قتیبہ الدینوری کے حوالے سے یہاں تک کہتے ہیں کہ قصی کو خود قیصر روم نے مدد دی تھی جس کے ذریعہ اس نے مکہ پر قبضہ حاصل کیا۔ دیکھئے "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" ص۳۱ بحوالہ کتاب المعارف، طبع یورپ ص۳۱۳، تاہم یہ بات مجھے کتاب المعارف کے کسی نسخہ میں نہیں مل سکی (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۳۰ تا ۱۳۴، الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ابو عبد اللہ محمد، بیروت دار صادر [illegible] جلد ۱ ص [illegible]، تاریخ الرسل والملوک طبری ابو جعفر محمد بن جریر، مصر دار المعارف ۱۹۶۱-۹ء جلد ۲ ص ۲۵۰، ۲۵۵-۲۵۶، ۲۵۹، [illegible] القرآن جلد ۲ ص [illegible] تا [illegible]۔

تھے اور غیر ملکی تاجروں سے جو ان کے شہر میں داخل ہوتے تھے وہ تجارتی ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ یثرب میں بھی عرب قبائل کے علاوہ یہودیوں کی جماعت آباد تھی جن کی ایک منظم معیشت اور معاشرتی نظام تھا[1] یہودی تجارت پر قابض تھے تو اہل مدینہ زراعت پیشہ تھے۔ یہی حال طائف میں آباد مرفہ الحال بنو ثقیف کا تھا۔ یہ شہر مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ جو کسی زمانے میں پہاڑوں کے مختصر دروں یا صحرا کے دامن میں کسی بڑے نخلستان کے سہارے آباد ہو گئے تھے۔ ان شہروں میں رہنے والے اگرچہ ایک ہی جگہ مستقل قیام کر چکے تھے مگر بدوی تہذیب و تمدن، عزت نفس اور حریت پسندی وغیرہ جملہ خصائل و عادات میں اپنے بادیہ نشین ہم وطنوں کے ساتھ پوری طرح مشابہ تھے اور ان شہروں میں بھی قبائلی نظام چل رہا تھا۔ چنانچہ اگر مکہ کی شہری ریاست قبیلہ قریش کی تھی، اس کے مختلف عہدے قبائل قریش کے درمیان تقسیم تھے اور ایک اعتبار سے یہ مناصب انہی بطون قریش میں موروثی تھے تو دوسری طرف یثرب کے عرب قبائل بھی اوس و خزرج کے متعدد بطون پر مشتمل تھے اور ان کا نظام بھی قبائلی ہی تھا۔ جو یہودی یہاں آباد تھے وہ بھی قبائل میں منقسم اور ایک دوسرے سے دست بگریباں رہتے تھے۔

گویا عرب کے صحرا ہوں یا شہر طرز زندگی بہرحال قبائلی تھی اور جہاں قبائلیت ہوتی ہے وہاں سیاسی لامرکزیت ہوتی ہے۔ عرب معاشرے میں ہر قبیلہ ایک اکائی اور سیاسی اعتبار سے خود مختار تھا۔ پورے عرب میں کسی ایسی منظم حکومت کا پتہ نہیں چلتا

[1] یثرب میں مکہ جیسی کوئی شہری ریاست تو نہ تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قبیلہ کی اپنی مجلس شوریٰ یا محلہ وار مجالس ہوتی تھیں جسے سقیفہ کہتے تھے (عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی، ڈاکٹر حمید اللہ، کراچی اردو اکیڈمی ۱۹۸۱ء ص ۳۱)

جس کے سامنے سارے قبائل جوابدہ ہوں اس لئے قبائل کو من مانی کرنے کی ایک گونہ آزادی تھی۔ کسی مرکزی حکومت کی عدم موجودگی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ملک میں معاشی وسائل محدود ہوں۔ آئے دن کی جنگوں کا باعث تھی۔ اصل میں ایک بدوی کی زندگی سخت ناساعد حالات میں بسر ہوتی تھی۔ اکثر اوقات خوراک کے وسائل و ذرائع آبادی کے اعتبار سے کافی نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ہر طاقتور کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ کمزور کے پاس اس قسم کے جو ذرائع و وسائل مثلاً اونٹ، مویشی وغیرہ ہوں ان پر قبضہ کر لیا جائے۔

بدوی جن کی معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا۔ چارے اور پانی کی تلاش ان کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر قبضے کے لئے ان میں آئے دن جنگ کا بازار گرم رہتا تھا[1]۔ عرب قبل اسلام کی ان قبائلی جنگوں کو ایام العرب (عرب کے دن) کہتے ہیں[2]۔

[1] دیوان الحماسہ (شرح)، مصر، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر (تاریخ ندارد) جلد ا صفحہ ۳۲۹ [2] المیدانی نے "مجمع الامثال" کے ۲۹ ویں باب میں "ایام العرب" سے بحث کرتے ہوئے زمانہ قبل از اسلام کے ۱۳۲ ایام کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایام کسی ایک نسلی گروہ کے دوسرے یا مختلف نسلی گروہوں کے درمیان ہی نہ تھے، بلکہ ایک ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل آپس میں دست بگریباں ہو جاتے تھے۔ اسی طرح عرب و عجم کی ہم سایہ متحارب جماعتیں بھی مصروف جنگ رہتی تھیں۔ چند مشہور ایام العرب میں سے ایک جنگ بسوس تھی جو ربیعہ کے دو قبائل بنو بکر اور بنو تغلب کے درمیان اونٹ کو چرانے پر ہوئی تھی۔ دوسری مشہور جنگ حرب داحس و غبرا تھی جو دو گھوڑوں کی مسابقت اور شرط کی رقوم کی ہار جیت پر اختلاف ہو جانے کے باعث مضر کے دو قبائل عبس و ذبیان کے درمیان ہوئی۔ تیسری مشہور جنگ حرب فجار تھی جس میں ایک فریق قریش اور کنانہ تھے اور دوسرے فریق ہوازن (قیس عیلان) (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر)

اگرچہ عرب جاہلیت کی یہ تمام جنگیں صرف معاشی اسباب کی بنا پر ہی نہیں لڑی گئیں مگر ان میں سے بیشتر لڑائیوں کا محور یہی چراگاہیں، پانی کے کنویں، مویشی اور مال تجارت کی لوٹ تھی۔ ان لڑائیوں سے فاتح قبائل کو نہ صرف مال غنیمت کی شکل میں معاش کے نئے ذرائع حاصل ہوتے تھے بلکہ مغلوب قبائل کے افراد قتل یا قید کے باعث کم ہو کر ان کے معاشی دباؤ کو بھی کم کر دیتے تھے۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ اس قسم کی جنگوں کی وجہ سے عربوں میں عرب قومیت کے جذبات فروغ نہیں پا سکے۔ ان کا سب کچھ ان کا قبیلہ ہی تھا۔ دیگر قبائل (حالانکہ وہ عرب ہی ہوتے تھے) کا مال و متاع ان کے لئے جائز تھا۔

یہ لوٹ مار صرف چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کی غرض سے ہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ تجارتی قافلوں کو لوٹ کر ان کے سامان پر قبضہ کرنے اور ان کے معتوب افراد کو غلام بنا لینے کو بھی عرب کی معاشرت کا کثیر الوقوع واقعہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے قریش اور دیگر قبائل عرب نے تجارتی قافلوں کی بسلامت آمد و رفت کی غرض سے مختلف ممالک سے معاہدے بھی کئے تھے۔

کاروان تجارت کی بسلامت آمد و رفت کی غرض سے قریش نے بیرون و اندرون عرب متعدد معاہدے کئے تھے۔ مکہ میں عبد مناف کے بیٹوں میں ہاشم نے شاہان روم اور آل غسان سے، عبد شمس نے نجاشی الاکبر سے، مطلب نے ملوک حمیر سے اور نوفل نے اکاسرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) تھے۔ ایام العرب میں چوتھی قابل ذکر جنگ عرب ذی قار کے نام سے مشہور ہے جو ربیعہ کے قبائل اور ایران کی شاہی فوج کے مابین شاہان حیرہ کے امانت رکھے ہوئے سامان کی واپسی کے تنازع پر ہوئی (السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام جلد ا صفحہ ۱۹۵ تا ۱۹۸ نیز صفحہ ۳۰، الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، بیروت دار صادر ۱۹۶۵ء جلد ا ص ۵۰۲ تا ۴۸۲)

ایران سے ان کے ممالک میں تجارتی قافلوں کی بحفاظت آمد و رفت اور عربوں کی نوآبادیوں کے لئے اجازت حاصل کی اور معاہدے کئے۔ اسی طرح رابیہ (حضرموت) میں قریش، ملوک کندہ کی حفاظت میں اپنا مال لے جاتے تھے۔ وہ تمام قبائل عرب میں سامان تجارت لے کر جاتے تھے مگر ان ہی معاہدوں اور خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جاتی تھی[1]۔

قرآن مجید میں سورہ القریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی احسان کی طرف اہل قریش کو متوجہ کیا ہے کہ اللہ نے حج کی وجہ سے انہیں کھانے پینے کی فراغت عطا کی تھی اور خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے پورے عرب کے دل میں خانہ کعبہ کی طرح قریش کی عظمت بھی پیوست تھی اس بنا پر وہ "جیران اللہ" یعنی خدا کے پڑوسی سمجھے جاتے تھے اور لوگ انہیں ستانے کی جرات نہ کرتے تھے اور ان کے تجارتی قافلے بے دھڑک گزرا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ بعض مہینوں میں قتل و غارت گری کو حرام قرار دے دیا گیا تھا، مگر ان "اشہر الحرام"[2] کی بھی بعض اوقات پروا نہیں کی جاتی تھی اور جنگیں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی

---

[1] الطبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۷۵ تا ۷۸۔ تاریخ الرسل والملوک جلد ۲ صـ۲۵۲ [2] عربوں میں جن چار مہینوں میں جنگ حرام تھی انہیں اشہر حرام کہتے تھے۔ اسلام نے بھی اس حرمت کو برقرار رکھا ان میں تین مسلسل مہینوں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک علٰحدہ مہینہ رجب تھا۔ مگر کئی دفعہ خود عربوں نے ان حرام مہینوں کی حرمت کو پامال کیا۔ عربوں میں اشہر حرام کا طریقہ سب سے پہلے حذیفہ بن عبد کنانی مضری نے رائج کیا (ابن ہشام جلد ۱ ص ۴۵، ۴۶) ان حرام مہینوں کو حلال کر کے ان میں جنگ کرنے کا ایک طریقہ عربوں نے یہ بنا لیا تھا کہ ہر تیسرے سال نسئی کر کے تیرہویں مہینے کا اضافہ کر لیتے تھے جو ذوالحجہ اور محرم کے درمیان ہوتا تھا (بقیہ حاشیہ صـ۳۱ پر)

کہ عام تاجروں کے علاوہ بڑے بڑے سرداروں کے اسباب تجارت بھی بازاروں میں اسی وقت بحفاظت آسکتے تھے جب ان کی باربرداری اور خیانت کی ضمانت قرب و جوار کے قبائل نے لی ہو۔ عرب کے مختلف بازاروں میں اسباب تجارت کو بحفاظت پہنچانے کی غرض سے تاجروں کو ایک رقم دینا پڑتی تھی جسے "خفارہ" کہتے تھے جس کے لفظی معنی ہیں کسی کو اپنی پناہ میں لینا۔ خواہ معاوضہ کے ساتھ یا بلا معاوضہ۔ دومۃ الجندل کے بازار میں جو ربیع الاول کے پہلے پندرہ دنوں میں لگتا تھا، تجار بنو کلب و جدیلہ کی حفاظت میں خرید و فروخت کرتے تھے مشقر کے بازار میں جو جمادی الآخرہ میں لگتا تھا بنو عبدالقیس اور بنو تمیم کا عمل دخل تھا اور ان کی رضامندی کے بغیر یہاں مال لانا ممکن نہ تھا۔ رابیہ (حضرموت) میں بنو آکل المرار (ملوک کندہ) اور آل مسروق بن وائل حضرمی کے زیر خفارہ مال تجارت لایا جاتا تھا۔ عکاظ کا مشہور بازار جو اشہر حرام (ذوالقعدہ، ذوالحجہ) میں لگتا تھا۔ البتہ خفارہ سے پاک تھا۔ خفارہ کی رقم عشور کے علاوہ ہوتی تھی جو تجار کو بازار کی زمین استعمال کرنے اور راہداری کے عوض دینا پڑتی تھی[1]۔

(بقیہ حاشیہ صـ۳۰) اسی کا اعلان حج کے موقع پر کیا جاتا تھا، یہ اضافہ شدہ مہینہ حرام نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ سے حرام مہینوں کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا تھا، پھر حرام مہینوں کی تعداد پوری کرنے کے لئے آئندہ مہینے بھی صفر کو حرام قرار دیتے تھے جو عام حالات میں حرام مہینہ نہیں تھا اسی نسئی کے بارے میں قرآن میں عربوں کو متنبہ کیا گیا ہے (دیکھئے سورہ توبہ: آیت ۳۷) اور اسی کی ممانعت رسول اللہؐ نے بھی خطبہ حجۃ الوداع میں کی تھی۔ تاریخ الرسل والملوک جلد ۳ ص ۱۵۰، نیز الازمنۃ والامکنۃ جلد ۲ ص ۱۶۶، نیز عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ڈاکٹر حمید اللہ ص ۴۹ تا ۵۰) [1] الازمنۃ والامکنۃ: ابی علی المرزوقی الاصفہانی، حیدرآباد دکن ۱۳۳۲ھ ج ۲ ص ۱۶۱-۱۶۷۔

یہ سب قوانین ضرورت کے مطابق جاری کئے گئے تھے کیونکہ جس معاشرے میں کوئی مستقل حکومت نہ ہو وہاں کوئی اکیلا شخص یا کمزور قبیلہ کس طرح زندہ رہے؟ لہٰذا ضرورتاً یہ عرف یا قوانین بنتے گئے جن کا اس معاشرے میں احترام کیا جاتا تھا حالانکہ بظاہر کوئی قوت نافذہ موجود نہ تھی۔ لیکن ان کی معاشرتی و معاشی ضرورت ہی ان کے لئے مقنن اور قوت نافذہ کا کام دے رہی تھی یہ دوسری بات ہے کہ اس کے خلاف بھی ہوتا رہا جیسا کہ سطور بالا میں لکھا گیا۔

الغرض ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد لاقانونیت جس کا مزاج لامرکزیت اور جس کی معیشت غنائم پر ہو، اس میں ذاتی اور اجتماعی حفاظت کے لئے جو طریقہ رائج ہوگا وہ قبائلی ہوگا۔ کسی مضبوط حکومت اور مذہب کی عدم موجودگی میں انفرادی اور اجتماعی بقا کی ضمانت قبائل کی باہمی عصبیت پر ہوگی۔ چنانچہ عرب جاہلیت میں معاشرے کی ہئیت ترکیبی قبائلی نوعیت کی تھی اور قبائلی عصبیت کے باعث لوگ اپنی جان اور مال کو محفوظ تصور کر سکتے تھے۔ عربوں کی اس قبائلی عصبیت کی اساس اتحاد نسب تھی۔ چنانچہ ایک باپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد ایک رشتہ اتحاد میں پروئے ہوئے تھے۔ جب کسی قبیلے کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور تمام حصے الگ الگ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے۔ ان میں طرح طرح کے اختلافات سر اٹھا لیتے تاہم خاص خاص موقعوں پر مشترکہ مفاد و حفاظت کے لئے یا کسی غیر معمولی فوجی مہم کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے۔

عربوں کا یہ قول مشہور تھا "میں اور میرا بھائی چچا کے لڑکے سے جنگ کر سکتے ہیں۔ لیکن غیر کے مقابلے میں، میں اور میرا چچا زاد بھائی دونوں ایک ہیں"[1] (حاشیہ صفحہ ۳۳ پر)

اس قبائلی عصبیت کی حد یہ تھی کہ ہر شخص اپنے بھائی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا تھا خواہ اس کا بھائی ظالم ہو یا مظلوم۔ بقول ابن خلدون انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز، رشتہ دار پر ظلم برداشت نہیں کر سکتا[1]

اب ایسی حالت میں جب کہ طاقت و عصبیت کا دارومدار قبائل پر ہو اور ملک میں عام لاقانونیت کا چلن ہو کوئی مربوط سیاسی نظام بھی نہ ہو تو ہر قبیلہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنی قوت و طاقت میں اضافہ کرے قوت میں یہ اضافہ کثرت تعداد ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اولاد نرینہ کی کثرت انتہائی طمانیت کی بات تھی۔ عرب جاہلیت میں سرداری کے لوازمات میں سے ایک کثیر العیال ہونا بھی تھا، جماعت کی تعداد، اکثریت کی قوت اور رشتہ داروں کے زیادہ سے زیادہ پھیلنے کو عرب عزت و غلبہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عرب متعدد عورتوں سے بیک وقت نکاح کیا کرتے تھے۔ (باقی)

(حاشیہ صفحہ ۳۲) [1] "تاریخ تمدن الاسلامی" جرجی زیدان، قاہرہ دار الہلال ۱۹۳۶ء جلد ۴ ص ۱۹ (جرجی زیدان کو غیر مستند سمجھا جاتا ہے اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ جرجی زیدان کو صرف تائیدی حوالے کے طور پر قبول کیا جائے۔ جرجی زیدان کا بیان کردہ یہ مقولہ مجھے کسی بنیادی ماخذ میں نہ مل سکا لیکن عرب معاشرت کے عام احوال جو ہمارے سامنے ہیں ان کے پیش نظر جرجی زیدان کا یہ بیان قابل قبول ہو سکتا ہے۔ [1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۰۱۔

شہر بریلی کی عمارات

از جناب سید مصطفےٰ علی بریلوی صاحب*

معارف بابت نومبر ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا ایک مبسوط مقالہ درج بالا عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اسی سے ملتے جلتے موضوع پر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کا ایک مقالہ "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات" العلم سہ ماہی کراچی بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین کی تحریر اہم ہے اور اس سے ہمارے علم میں کچھ مزید مفید باتیں آتی ہیں۔

راقم کو فی الوقت روہیل کھنڈ کے اسلامی عہد کی عمارات اور آثار پر کچھ عرض کرنا ہے اس امر پر تمام مورخین متفق ہیں کہ ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ شجاع الدولہ نے انگریزی توپ خانے کی مدد سے روہیلہ قوت کو شکست دی۔ حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ شہید ہوئے اور شہر بریلی، پیلی بھیت اور آنولہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ بریلی شہر کی تباہی اس نوع کی ہوئی جس کی عام طور پر تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس کی دوسری بار عظیم تباہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اول کے بعد رونما ہوئی۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین نے اپنے مقالہ میں جن باقی ماندہ عمارات و آثار کا ذکر کیا ہے، مگر

---

* اڈیٹر سہ ماہی العلم آل پاکستان ایجوکیشنل کراچی۔

ان میں چند کے ذکر شامل ہونے سے رہ گیا یا ان کے تذکرے میں اغلاط و مطالب سہواً مرتب ہوئے ہیں۔ اس پہلو پر مختصراً ذیل میں چند سطور پیش کرتا ہوں۔

بارہ دری شہر بریلی کہنہ جب ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج شہر کے نواحی علاقوں میں داخل ہوئی اس وقت غازیوں کے ایک گروہ نے مقابلہ کیا اور پسپا ہوتے ہوئے ایک مضبوط عمارت بارہ دری میں محصور ہوگئے۔ محصورین تلواروں سے مسلح تھے، جب کہ حملہ آور برٹش آرمی کے پاس بندوقیں تھیں تاہم سخت مقابلہ ہوا جس میں انگریزی فوج کا جانی نقصان ہوا بالآخر چالیس پچاس مجاہدین شہید ہوئے۔ انگریزی سپاہ کے جن ہندوستانیوں کو اس مقابلہ میں انڈین میرٹ آرڈر سے نوازا گیا وہ ایک کتاب میں ہم کو کراچی کی فٹ پاتھ پر بہمدست ہوئی۔ کتاب کا نام انڈین آرڈر آف میرٹ ہے۔ اس کے مرتب مسٹر پی۔ پی رہائی لر ہیں اور آرمی ڈپارٹمنٹ شملہ سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب کتب خانہ ایجوکیشنل کانفرنس کراچی میں محفوظ ہے۔ میں نے اس بارہ دری کو اپنی نقل مکانی ۱۹۵۰ء تک کھنڈر کی شکل میں دیکھا تھا۔ عمارت دو منزلہ تھی اوپر کی چھتیں گولہ باری سے اُڑ گئی تھیں۔ ملبہ بدستور گرا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ یہ بھی اتفاق ہوا کہ محلہ کی ایک محفل میں دریاں بچھادی گئی تھیں، اس میں راقم شریک بھی ہوا تھا۔ دیواروں پر بکثرت گولیوں کے نشان تھے جن سے محسوس ہوتا تھا کہ کمرہ در کمرہ سخت مقابلہ ہوا تھا۔ گراؤنڈ فلور ملبہ سے اٹا ہوا تھا۔ اور ظاہر ہے کوئی اندر نہیں جاتا تھا۔ اس عمارت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی لیکن حکومت نے آزادی ملک کے بعد سرمایہ کثیر صرف کر کے اس کو تھانہ بارہ دری میں تبدیل کر دیا۔

سنہری مسجد بریلی شہر میں مغرب سے مشرق تک از محلہ قلعہ تا شہامت گنج ایک کئی میل طویل بازار ہے۔ اس کے وسط میں ایک مسجد سرراہ سنہری مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہاں انگریز افسران پر حملہ ہوا تھا۔ اس کا ذکر فریڈم اسٹرگل میں ہے۔ مقالہ زیر گفتگو میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

مرزائی مسجد شہر کہنہ کا کتبہ مرزائی مسجد شہر کہنہ عہد اکبری کی تعمیر کردہ ہے۔ فیضی نے اس کی تعمیر کے سلسلے میں عربی ابیات کہی تھی۔ وہ مسجد کی محراب کے پاس کندہ ہے۔ ابیات یہ ہے 'فاسجد واخالصاً لوجہ اللّٰہ'۔

مسجد نو محلہ مسجد نو محلہ اور جامع مسجد قلعہ کا ذکر دو مختلف مواقع پر کچھ اس طرح مقالہ مذکورہ میں کیا گیا ہے کہ بات واضح نہیں ہوتی۔ قلعہ کی مسجد کی حیثیت وحقیقت پر ڈاکٹر لطیف کی رائے درست معلوم ہوتی ہے لیکن مسجد نو محلہ جو خاصے طویل فاصلہ پر واقع ہے اس کی کہانی جدا ہے۔ یہ مسجد دراصل ان نو محلات کی مسجد تھی جس میں سادات عظام کے وہ گھرانے قیام پذیر تھے جن سے روہیلوں کو گہری عقیدت تھی۔ ان مکانوں/محلات سے متعلق وسیع آراضی تھی جن میں غالباً باغات تھے۔ جب یہ علاقہ ختم کرنے کا فیصلہ ہوا تو زمین کی جگہ کتب خانہ، موتی پارک (یا جو بھی پہلے نام ہو) ڈاک خانہ، سول ہسپتال، گورنمنٹ ہائی اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوئے۔ پرانی حویلیوں/محلات/مکانات میں اب صرف مسجد نو محلہ باقی ہے۔ سادات کے محلہ یا محلات کی تباہی کا ثبوت رضا لائبریری رام پور میں موجود ایک کتاب 'ہناتیج الریاست' کے تکملہ بہ عنوان 'آثار محشر' سے ہوتا ہے۔ پروفیسر ایوب قادری نے تکملہ کتاب کا ترجمہ اپنی کتاب ۱۸۵۷ء مطبوعہ ۱۹۷۶ء کے صفحات ۱۶۱-۱۷۶ میں شامل کیا ہے۔ کتاب کے مصنف سید محمد رضا

لکھنوی تھے۔ وہ اور ان کے والد عرصہ دراز تک سرکاری ملازمت کے حوالہ سے بریلی شہر میں مقیم رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"انگریز مع فوج بریلی میں داخل ہوئے۔ (۱۸۵۷ء) مخلوق کا قتل، پھانسی اور عمارات کھودنے اور ڈھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بریلی کے سیکڑوں لوگ پھانسی پر لٹکائے گئے۔ شہر کی رعایا میں سے کچھ لوگ مقابلہ پر آئے۔ انہوں نے شکست کھائی اور مارے گئے (غالباً بارہ دری کے مقابلہ کی طرف اشارہ ہے) نو محلہ کا محلہ دوسرے محلوں کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔"

درج بالا عبارت سے واضح ہوا کہ مسجد نو محلہ یا محلہ نو محلہ سے متعلق تھی۔ اب ڈاکٹر میاں کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ:

"مغلوں کے گورنر خیر اندیش خاں نے قلعہ اور مسجد تعمیر کرائی تھی اور کہ قلعہ کا وجود تو ختم ہو چکا مسجد اسلامیہ کالج بریلی کے متصل جانب شرق واقع ہے۔ یہ مسجد نو محلہ کہلاتی ہے۔"

جس قلعہ کے وجود کو ختم کرنے کی بات کہی گئی ہے وہ کافی فاصلہ پر آج کل کے محلہ قلعہ پر آباد تھا اور اس قلعہ کی مسجد جامع مسجد قلعہ کے نام سے موسوم ہے اور واقعتاً مغلوں کے عہد کی تعمیر ہوگی۔

سادات نو محلہ کی رہائش گاہوں کے سلسلہ میں سید الطاف علی بریلوی نے اپنی آخری کتاب 'تخلیقات و نگارشات' میں لکھا ہے:

"میرے نانا سید شجاعت علی ضمناً میری انگلی پکڑ کر اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی کے وسیع احاطوں میں کبھی کبھی ٹہلانے لے جاتے تھے۔ ایک روز کرکٹ پولین کے

سامنے ٹھہر کر بولے 'یہاں ہمارا مکان تھا جو ہاتھیوں سے ڈھایا گیا تھا'۔

'اسکول کمپاؤنڈ کے باہر محلہ قرولان کی سڑک پر ایک برگد کا درخت تھا۔ اس کے نیچے سے اوپر تک دیکھ کر آہ سرد بھری اور بتایا کہ اس پر سب کو پھانسی دی گئی تھی'۔

'نانا صاحب مجھے کبھی کبھی بریلی کی مشہور مسجد نو محلہ میں بھیجے جاتے اور وہاں عہد حافظ رحمت خاں کے مجاہد سید حسن شاہؒ اور سید معصومؒ کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے بعد مسجد کے چوڑے چکلے کنویں کے پاس کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتے۔ میں نے پانی کے کنویں پر فاتحہ پڑھنے کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ سب سیدانیاں اپنے اپنے جسموں سے پتھر باندھ کر اس کنویں میں کود گئی تھیں تاکہ ان کی آبرو پر حرف نہ آئے'۔

راقم السطور بارہا اس کنویں پر گیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کنویں کی جگہ کسی تاجر نے ایک طاق بنا دیا ہے اور عامۃ الناس ضعیف الاعتقادی کی بنا پر ہار پھول چڑھاتے ہیں۔

مسجد بی۔ بی جی بہاری پور جب ہر بات کتبہ جات پر ہی محمول کی جائے تو پھر مسجد بی۔ بی جی زوال ریاست روہیل کھنڈ سے پہلے یا بعد کی بنانے پر میں کوئی اعتراض کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں مسجد بی۔ بی۔ جی کی قدامت کے بارے میں چند سطور لکھنے پر اس واسطے مجبور ہوا کیونکہ ڈاکٹر لطیف نے مسجد کی تعمیر کے وقت کے تعین کے سلسلہ میں سید الطاف علی بریلوی کے بیان کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سید الطاف علی بریلوی نے اپنے بیان کی تائید میں حوالہ نہیں دیا۔ یہ بیان مشکوک معلوم ہوتا ہے"۔

سید صاحب نے حیات حافظ تین چار سال محنت شاقہ کر کے اور ہزارہا نواب زادوں اور متعلقین کے انٹرویو نیز کتب کی چھان بین اور پورے علاقے میں گھوم پھر کر مرتب کی تھی

میرا بچپن تھا تاہم ناسمجھی کے باوجود بہت سی باتیں یاد ہیں۔ لطیف میاں کا یہ خیال کہ نواب شجاع الدولہ کے مظالم اور پرآشوب ماحول میں مسجد تعمیر کرانا بعید از قیاس ہے"۔ بڑی کمزور دلیل ہے۔ دنیا میں بعض اوقات عظیم تباہی کے دوران کچھ نہ کچھ افراد طوفان بلاخیز میں مال و متاع بچا بھی لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں بی۔ بی صاحبہ اگر اپنا مال و زر بچانے میں کامیاب ہوئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ رہا مخالف حکومت میں کوئی بڑا کام کرنا تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جس کی مثال حافظ رحمت خاںؒ کی شہادت کے صرف ایک سال بعد راؤ پہاڑ سنگھ جو حافظ صاحب کے دیوان تھے۔ اپنے محسن شہید کے مقبرہ کی بنیاد رکھنے کا واقعہ ہے اگرچہ جلد دنیا سے کوچ کر جانے کی وجہ سے وہ کام مکمل نہ کر سکے بلکہ نواب ذوالفقار خاں ابن حافظ رحمت خاں نے یہ کام انجام دیا۔

بریلی شہر میں مغلوں کے ابتدائی دور میں دو محلے آباد ہوئے (۱) محلہ اعظم نگر (۲) محلہ شاہ آباد۔

محلہ اعظم نگر اورنگ زیب کے بیٹے اعظم شاہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس محلہ میں جناب ولی اللہ ممبر میونسپل بورڈ کراچی کے مکان سے متصل سر راہ ایک سرخ پتھر کی بنی ہوئی عہد حافظ کے ایک بزرگ کا مزار سوا دو سو سال کی برساتیں جھیل کر بدستور موجود ہے۔ قبر پر نام کندہ ہے۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے غالباً کوئی معروف روہیلہ بزرگ تھے ---- ڈاکٹر لطیف بزرگ کا نام پڑھ کر تحقیق کر سکتے ہیں۔

نواب عنایت خاں جو حافظ رحمت کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور اپنی بہادری اور دلیری میں شہرت رکھتے تھے بالخصوص جنگ پانی پت ۱۷۶۱ء میں انہوں نے کارہائے نمایاں ادا کیے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف نے ان کی پختہ قبر کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ

ان کے ساتھ ایک اور کسی شخص کی قبر ہے۔ میں ۱۹۳۴ء میں عم محترم سید الطاف علی بریلوی کے ساتھ عنایت خاں کی بغیہ (یہ ہی اس وقت نام تھا) اور کی کچہری کی دعوت میں شریک ہوا تھا۔ یہ دعوت ان بزرگ نے کی تھی جن کا نام نیاز حسین تھا اس وقت عنایت خاں کی قبر کچی تھی اور کوئی کتبہ نہیں تھا اور آبادی بھی بہ ظاہر نہیں تھی۔ ان بزرگ کا وہیں قیام تھا۔ سید الطاف علی بریلوی نے ان بزرگ کا احوال اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

میں نے اپنی یادداشتیں اس لئے تحریر کر دیں تاکہ تاریخ ساز شہر بریلی کے بارے میں شاید کچھ کام آسکیں۔

تاریخ ہند کے موضوع پر دارالمصنفین کی اہم کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ مقدمہ رقعات عالمگیر	سید نجیب اشرف ندوی	قیمت ۸۰ روپے
۲۔ اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر	علامہ شبلی نعمانی	" ۸۵ روپے
۳۔ بزم تیموریہ اول	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	" ۱۵۰ روپے
۴۔ " دوم	"	" ۵۰ روپے
۵۔ " سوم	"	" ۵۶ روپے
۶۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے "	"	" ۸۰ روپے
۷۔ عرب و ہند کے تعلقات	سید سلیمان ندویؒ	" ۹۵ روپے
۸۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	ابوالحسنات ندوی	" ۲۵ روپے
۹۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں	ترجمہ علی حماد عباسی	" ۵۶ روپے

قاضی عبدالنبی احمد نگری

از جناب اسلم مرزا صاحب ٭

ملک احمد نظام شاہ نے ۱۴۹۰ء میں احمد نگر میں جس نظام شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اسے مغلوں نے ۱۶۰۰ء میں فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیا تاہم اس کے بعد قریب ۳۶ برس تک ملک عنبر، راجو دکھنی اور شاہ جی بھونسلے نے کسی نہ کسی طرح نظام شاہی حکومت کو برقرار رکھا۔ ان ۳۶ برسوں میں نظام شاہی حکومت کا پایہ تخت احمد نگر کی بجائے جنیر، پرانڈہ اور دولت آباد رہا۔ لیکن ۱۶۳۶ میں شاہ جہاں نے اس سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا شاہ جہاں نے دولت آباد اور احمد نگر کے علاقوں کو جوڑ کر ایک نیا صوبہ ترتیب دیا۔ اورنگ زیب پہلی مرتبہ دکن میں جولائی ۱۶۳۶ء میں صوبیدار کی حیثیت سے داخل ہوا۔ یہ صوبیداری ۸ مئی ۱۶۴۴ء تک رہی اس کے بعد دوسرے صوبیدار آئے۔ اورنگ زیب دکن کی صوبیداری پر جب دوسری مرتبہ مامور ہوا تو جنوری ۱۶۵۳ء میں پہنچا اور یہاں اس کا قیام ۵ فروری ۱۶۵۸ء تک رہا۔

اس عرصہ میں دکن میں مغلیہ سلطنت کے قوانین کا نفاذ ہوا۔ مغلوں نے شمالی ہند کے صوبہ جات میں جو نظام عدل قائم کیا تھا اسی طرز پر دکن کے نئے مقبوضہ علاقے بھی 'صوبہ'

٭ ۸۰۔ سلیم کامپلکس۔ پہلا منزلہ۔ ڈیوڑھی بازار، اورنگ آباد۔

سرکار اور پرگنوں میں تقسیم کئے گئے۔ صوبہ دولت آباد میں احمد نگر، پٹن، بیڑ، جالنہ، جنیر، سنگم نیر اور دھاروڑ کو شامل کیا گیا۔ شہر احمد نگر اور اس کے اطراف و جوانب کے موضع اور دیہات احمد نگر سرکار کے تحت آئے اور اس سرکار کی نظم و نسق کے لئے فوج دار، کوتوال، عامل اور قاضی مقرر ہوئے۔

مغلیہ سلطنت میں عہدۂ قضا کی اہمیت

مغلیہ سلطنت میں قاضی کا عہدہ نہایت اہم ہوا کرتا تھا۔ مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپنی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری" جلد سوم میں ڈاکٹر پی سرن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ جس سے قاضی کے عہدے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے[۱]۔ منصب قضا پر فائز ہونے کے لئے علوم اسلامیہ خصوصاً علم فقہ اور اصول فقہ پر مکمل دسترس اور معاملہ فہمی کے ساتھ تدبر کا ہونا نہایت لازمی تھا۔ کیونکہ مذہبی اور معاشرتی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، وراثت یا شہری جھگڑے کے مقدمات قاضی کی عدالت میں طے ہوتے تھے۔ عدل اور انصاف کا محکمہ کوتوال اور قاضی دونوں کے ذمہ ہوتا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے حکام کے لئے جو ہدایات جاری کی تھیں ان میں کوتوال کو خاص طور پر اس کی تاکید کی تھی کہ وہ تمام جھگڑوں کی نگرانی خود کرے اور جس کا تعلق شرعی مسائل سے ہو اس کو قاضی کے پاس بھیج دیا جائے۔ پرگنہ میں عدل اور انصاف کی نگرانی قاضی کیا کرتا تھا۔ اس کے سامنے شرعی اور شہری دونوں قسم کے قضیے پیش ہوتے تھے۔ اسی طرح سرکار اور پرگنوں میں مال کے مقدمے قاضی کے یہاں طے ہوتے تھے۔

سرکار اور اس سے نیچی عدالتوں میں ایسے دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ جن کا تعلق مذہب سے ہوتا تھا قاضی ہی صادر کرتا تھا۔ لیکن ان کی اپیل صوبہ کے صدر، قاضی یا میر عدل اور پھر وہاں سے صدر الصدور کے یہاں ہو سکتی تھی۔

شاہجہاں کے عہد میں قاضی کا عہدہ قاضی کے خاندان میں موروثی بن گیا تھا اور ایسا کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ یہ سمجھا گیا کہ تجربہ کار قاضی اس عہدہ کے لئے اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم و تربیت دے سکتے ہیں۔ قاضی کی کوئی فیس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن نکاح اور مہر کے وقت ان کے نذرانے مقرر تھے جن کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے[۲]۔

اورنگ زیب کی پہلی تخت نشینی ۲۱ جولائی کو ہوئی اور دوسری تخت نشینی ۵ جون ۱۶۵۹ء کو دہلی میں ہوئی۔ اورنگ زیب شمالی ہندوستان کے معاملات میں الجھا رہا۔ لیکن دکن میں بڑھتی ہوئی شورش کے مد نظر وہ اجمیر اور برہان پور ہوتے ہوئے ۲۲ مارچ ۱۶۸۲ء کو اورنگ آباد پہنچا یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد اورنگ زیب نومبر ۱۶۸۳ء میں احمد نگر پہنچا اور یہاں اپنی چھاؤنی قائم کی جہاں وہ ۲۶ اپریل ۱۶۸۵ء تک مقیم رہا اور یہیں سے مختلف مہمات کی رہنمائی کرتا رہا[۳]۔

قاضی عبدالرسول

قاضی عبدالنبی کے والد قاضی عبدالرسول شاید اسی زمانے میں اورنگ زیب سے ملے اور ۱۰۹۶ھ (مطابق ۱۶۸۶-۱۶۸۵ء) میں ان کو خلعت قضاۃ سے سرفراز کیا گیا۔ قاضی عبدالرسول کو قضات کے عہدہ پر کس طرح نامزد کیا گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قاضی شہاب الدین عثمانی اپنی تاریخ شہابی میں رقم طراز ہیں[۴]:

"ملاقات او (قاضی عبدالرسول عثمانی) از بادشاہ عالم گیر بود و ملازمت حاصل نمود۔ بادشاہ اعجاز و اکرام لانہایت کرد۔ آں وقت قاضی بلدہ احمد نگر نامی قاضی عیسیٰ بود۔ قاضی عبدالرسول صاحب عثمانی از تعلقہ قضا در ۱۰۹۶ ہجری سرفرازی یافتند۔"

تاریخ شہابی میں قاضی عبدالنبی کے والد قاضی عبدالرسول عثمانی کا سلسلۂ نسب اس طرح درج ہے۔ عبدالرسول بن ابو محمد بن ابو محمد بن عبدالوارث بن ابو محمد بن عبدالملک بن محمد اسمٰعیل بن شہاب الدین

بن حسام الدین سے ہوتا ہوا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اسی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالرسول کے اجداد پہلے گجرات میں آباد ہوئے اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں احمد نگر میں سکونت اختیار کی۔

یہاں ایک اور اہم بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شہر احمد نگر کی جامع مسجد کی تعمیر کا کام اورنگ زیب نے قاضی عبدالرسول کے سپرد کیا تھا۔ اس مسجد کے بنانے کی حقیقت یوں بیان کی جاتی ہے کہ قاضی عبدالرسول نے ایک لاوارث گوپال کھتری کی جائداد مبلغ بیس ہزار روپیہ بیت المال میں جمع کرنے کے لئے شہنشاہ اورنگ زیب کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ اورنگ زیب نے فرمان جاری کیا کہ غازیوں کے خزانہ میں یہ مال جمع کرنے کے بجائے اس سے کوئی مسجد تعمیر کی جائے اور اس کے لئے کوئی موزوں غیر مقبوضہ جگہ انتخاب کی جائے تاکہ وہ وقف کی جائے۔ قاضی عبدالرسول نے شہر احمد نگر اور مرتضیٰ نگر کی سرحد پر ایک جگہ پسند کی۔ یہ مسجد ۱۷۰۵ء میں مکمل ہوئی تھی اور آج بھی موجود ہے۔ اورنگ زیب کے فرمان کی نقل حسب ذیل ہے[۵]

مہر عالمگیر

شریعت و فضیلت پناہ قاضی عبدالرسول سلمہ اللہ تعالیٰ چوں درزماں میمنت بنواں حکم قضا جریان چناں شرف صدر یافت بیت المال کہ درخانہ مبلغ بیست ہزار روپیہ جمع ست آنرا داخل خزانہ نمائند و شریعت پناہ قاضی عبدالرسول در باب احداث کردن جامع مسجد التماس دارد۔ پس حکم ہمیں است کہ از ساد سل (کذا) نزول زمین افتادہ دریافتہ طول صد درع و عرض ہفتاد درع بگز شرعی در مرتضیٰ نگر مقرر رسانید از خزانہ چنگیز خاں یک تو آب معمول دار یہ و شما کہ قاضی القضات است۔ بقاضی عبدالرسول را بنویسد کہ مال بخیل را در

مال نمازیان داخل کردن چہ حاصل۔ فی سبیل در خرچہ می شود ہمہ را ثواب می رسد پس فضیلت پناہ را جواب باصواب سرفراز یافت داروغۂ نزول این نامہ مخلص نظر آئیندہ جائے کہ پنداشت بگیرید مسجد سازے۔ چناں تعجیل نمایند کہ تا آمادہ سواری مبارک بہ آں طرف مسجد تیار گردد معلوم باد۔ مرقوم پنجم شہر رجب المرجب ۱۱۱۲ھ جلوس والا قلمی[۶]

تاریخ شہابی کا بیان ہے کہ اورنگ زیب نے اس جامع مسجد میں دو مرتبہ نماز جمعہ ادا کی تھی۔

قاضی عبدالرسول کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام غلام نبی (عرف روح الہدیٰ) منجھلے بیٹے عبدالنبی اور سب سے چھوٹے بیٹے تھے غلام ہدیٰ۔ قاضی عبدالرسول گو کہ احمد نگر کی ایک مشہور شخصیت تھی لیکن ان کا انتقال کب اور ان کی تدفین کہاں ہوئی اس کی معلومات نہیں ملتیں۔ ۲۲ جمادی الاول ۱۱۲۹ھ مطابق ۴ اپریل ۱۷۱۷ء کے ایک محضر[۷] سے پتہ چلتا ہے کہ اس روز احمد نگر شہر پر دو مرتبہ مرہٹہ سردار کھنڈو دھباڑیا اور سلطان جی نمبالکر نے بے شمار مرہٹہ سپاہیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا اور اہل شہر کی مال و متاع لوٹی گئی۔ اس لوٹ کھسوٹ میں قاضی عبدالرسول کو موضع برودگاؤں پرگنہ پانڈے پیٹر گاؤں میں عطا کی گئی جاگیر کی اسناد پھاڑ ڈالی گئی تھیں۔ اس محضر پر قاضی عبدالرسول کے علاوہ شہر کے تقریباً ۳۶ عمائدین کی مہریں ثبت ہیں۔ ان ۳۶ ناموں میں ایک نام عبدالنبی امام و خطیب مسجد درگاہ بادشاہ کی بھی مہر ہے۔ احمد نگر پر مرہٹوں کے اس حملے کا ذکر تاریخ شہابی میں بھی مرقوم ہے[۸]۔ یعنی قاضی عبدالرسول ۱۷۱۷ء میں حیات تھے اور اس کے بعد ان کا انتقال ہوا ہوگا۔

قاضی عبدالنبی کی پیدائش اور تعلیم

قاضی عبدالنبی کی پیدائش احمد نگر میں کب ہوئی،

اس کا حوالہ کہیں نہیں ملتا۔ انہوں نے ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ والد کی وفات کے بعد علی عبداللہ احمد نگری اور سید بخش حسین کرمانی خیرآبادی ثم احمد نگری سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد گجرات کا سفر کیا جہاں شیخ قطب الدین صدیقی گجراتی سے دیگر کتابیں پڑھیں اسی طرح آپ شیخ محمد محسن ابن عبدالرحمن صدیقی گجراتی کے ساتھ ایک مدت تک حصول علم میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ صرف و نحو اور دیگر علوم شرعیہ میں کمال حاصل کیا۔

عہدۂ قضا قاضی عبدالنبی اپنے والد کے انتقال کے بعد احمد نگر میں عہدہ قضاۃ پر فائز ہوئے۔ قضات کے ساتھ ساتھ آپ نے درس و تدریس کے مفید مشغلہ کو جاری رکھا۔

قاضی عبدالرسول کو مغلیہ حکومت کی جانب سے احمد نگر کے تعلقہ شری گوندہ کے پرگنہ پانڈے پیڑ گاؤں میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۷۵۹ء کے ایک معاہدے میں جو پونہ کے پیشوا (سوم) اور احمد نگر کے قلعہ دار نواب قوی جنگ کے درمیان ہوا تھا۔ اس میں قاضی عبدالنبی کا بھی شامل ہے اور اس عہد کا ذکر ہے کہ قاضی عبدالنبی کی جاگیر اور انعام کی زمینیں اور محصول بکال رکھا جائے[10]۔

اولاد قاضی عبدالنبی کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام غلام حسین، غلام تقی، غلام نقی اور غلام اسحاق تھے۔ غلام اسحاق کے چار بیٹے تھے۔ حسن امین الدین، چاند صاحب، محمد صاحب اور شہاب الدین۔ یہ وہی شہاب الدین ہیں جنھوں نے تاریخ شہابی لکھی۔ اس کا فارسی مخطوط احمد نگر میں موجود ہے اور اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا[11]۔ قاضی شہاب کی اولاد احمد نگر میں ہیں اور شادیوں میں نکاح پڑھانے کی رسم ادا کرتے ہیں۔

وفات تاریخ احمد نگر میں ایک قلمی بیاض کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل مولف نے لکھا ہے کہ

قاضی عبدالنبی کا انتقال احمد نگر میں ہوا اور ان کی قبر بادا بنگالی کے مزار کے احاطہ میں تھی اور قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ تھا:

چوں بودند قاضی احمد نگر — بسا عالم و فاضل و متقی
بسال وفاتش بنویس اے علیم — بداد البقا رفت عبدالنبی

لیکن اب نہ یہ قبر ہے اور نہ مندرجہ بالا کتبہ کہیں نظر آتا ہے[12] بداد البقا رفت عبدالنبی سے سال وفات ۱۱۹۰ھ نکلتا ہے۔

مولانا حکیم عبدالحیٔ لکھنوی نے اپنی کتاب نزہتہ الخواطر میں اعتراف کیا ہے کہ قاضی عبدالنبی ایک برگزیدہ عالم و فاضل تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے مشہور علماء میں ہوتا ہے وہ بہت بڑے مصنف تھے۔ جن کتابوں کا ذکر مولانا حکیم عبدالحیٔ نے نزہتہ الخواطر میں کیا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے[13]۔

(۱) نحو کی ایک کتاب کافیہ ابن حاجب کی شرح جامع الغموض و منبع الفیوض (۲) یزدی کی شرح تہذیب پر مفصل حاشیہ[14] (۳) میر زاہد ملا جلال پر مفصل حاشیہ۔ (۴) علم صرف پر لکھی گئی کتاب دستور المبتدی پر مفصل حاشیہ۔ (۵) عاملی کی کتاب خلاصۃ الحساب پر مفصل حاشیہ (۶) اصول الحسامی پر مفصل حاشیہ (۷) مطول پر حاشیہ (۸) تفتازانی کی کتاب شرح العقائد پر مفصل حاشیہ (۹) شرح العقائد پر خیالی کے حاشیہ پر حاشیہ (۱۰) بحث کے آداب کے موضوع پر لکھی ہوئی شرح شریفیہ پر حاشیہ لکھا اور اس کتاب کا نام رشیدیہ رکھا (۱۱) تحقیقات (۱۲) سیف المبتدین فی قتل المغرورین (۱۳) جامع العلوم الملقب بدستور العلماء کی چار جلدیں مع ضمیمہ کے دائرۃ المعارف نظامیہ حیدرآباد سے ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی۔

جامع العلوم الملقب بدستور العلماء میں مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کی عربی اور

فارسی میں توضیح اور صراحت کی گئی ہے۔ کئی مقامات پر تاریخی مقامات نیز احمد نگر کی اس دور کی شخصیات اور حالات کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ کتاب اس وقت ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہوگی۔

قاضی عبدالنبی چونکہ عالم فاضل اور قضاءت کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے اس لئے اپنے عہد کے اکابرین اور علماء سے ان کے اچھے روابط تھے جس کا ذکر جامع العلوم میں جابجا ملتا ہے۔

شاعری: قاضی عبدالنبی کے صاحب دیوان شاعر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن جامع العلوم کے ضمیمہ میں انہوں نے بزبان اردو اور فارسی جو اشعار کہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں شعر گوئی کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ قاضی عبدالنبی کی اردو شاعری کا نمونہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

زبان اپنی عبدالنبی بند کر پس دل میں آپس کون خورسند کر
بڑوں کو بڑی بات ہے سازوار بود خاموشی شیوۂ خاکسار
نہنے منھ سے مت لے نوالے بڑے کہ قاضی برا راڑ رے سر پڑے
بہت ڈر کے چلنا تو اس گھات میں مگر جا رہے گا تو ادبات میں
وجیہ شاہ خدا ہے ترا دستگیر ولایت کے افلاک پر بے نظیر
سچا چاند ہے چودھویں رات کا اندھارا گیا دور گجرات کا
دکھایا تری جد کو اے خدا تجھے بھی دکھادے تو ہیگا روا
خدایا بعون وجیہ زماں مجھے دام دنیا سے دینا اماں
محمد کی امت میں دائم تو رکھ شریعت کے کوچے میں قائم قدم رکھ

پانچ سال کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد جامع العلوم الملقب بدستور العلماء کی تکمیل بروز جمعہ ۱۴ محرم الحرام ۱۱۷۳ھ کو بلدۂ احمد نگر میں ہوئی اس موقع پر قاضی عبدالنبی نے جو طویل نظم

کہی تھی اس کی بعض ابیات ملاحظہ ہوں:

بفضل خداوند عالی جناب بخوبی شدہ جلوہ گر این کتاب
بسی روز و شب در پیش تا ختم بسی عیش و آرام در باختم
پس از محنت سالہا شد تمام بعون محمد علیہ السلام
بود معدن گوہر بی بہا جواہر فروش و جواہر نما
باین جامعیت کہ دیدہ کتاب بہر سائلی میرساند جواب
بود روضۂ از ریاض جنان نشاندہ درو ہر گلی باغبان
ندیدہ کسی از وضیع و شریف بہار چنین در ربیع و خریف
نہالان او تازہ و بار وار خزان را ندا ندو داند بہار
بجز راستی سرو او دم نزد کمر بستہ در خدمت ہر خرد
ستادہ بیک پا درین انجمن رسانید مژدہ بصحن چمن[1]
کہ آزادی آمد ز قید خطا ہم از جہل و گمراہی ناسزا
نسیمی کہ عنبر فشان می وزد برخسارہ از ہارد لہا سزد
شفا را درو نسخۂ بو علی حیاضش ز آب بقا ممتلی
اگر مصر خوانی روا باشدت بخر ہر متاعی کہ می بایدت
بہر باب او گر گذاری قدم فروشند ہر جنس را بی درم
دکاکین بازار او زرنگار نشستہ درو سوقیان باوقار
بشنجرف قانی عمامہ بسر بمشک تتاری قبای[1] بہ بر

[1] المراد بہ تفصیل کل لغۃ مکتوب بالمداد الشنجرفی ۱۲ منہ

آخر میں یہ قصیدۂ غرا ملاحظہ ہو

بعد حمد کردگار و نعت احمد مصطفیٰ
می سرایم وصف این گلدستہ صدق و صفا

گلشن علما بود در وصف او گویم سرِ ز
جنت الفردوس والانہار تجری تحتہا

از خیابانش ہمہ گلہای رنگین از علوم
در نظر آید چو بکشا بند ہر یک بابہا

بحر مواج معانی جامع ابکار فکر
معدن لولوی ابحاث و لطائف بابہا

شمع بزم نکتہ دان مجلس افروز سخن
مبتدی را رہنما و منتہی را آشنا

ہمدم فضلا بود در دوستی کامل عیار
با وفا و با مروت بی نفاق و بی دغا

مردم چشم فطانت دیدہ نادیدگان
مردہ دل را زندہ سازد کور را کحل جلا

فاضلی صاحب کمالی واقف اسرار علم
عالم کنہ ہمہ اشیا مگر کنہ خدا

مخبر اخبار عالم از رہ وحدت کند
جملہ اخبار را راجع سوی یک مبتدا

بہتر استغفار از ین لاف و گزاف ای راستان
عفو فرمائید از جرم و خطای بی نوا

من کہ در احمد نگر در باختم عمر عزیز
کہ توانم ساختن چیزی را کہ کس گوید ثنا

لیک از طفلی بہ پیری شغل علمی در خواست
ہست بر من لمحہ تعطیل رنج سالہا

زین سبب دیوانہ کردہ ساختم مجموعہ[1]
گر قبول مقبلی افتد بیا داَید مرا

گر خطای رفتہ باشد ناظران را لازم است
اینکہ در اصلاح او کشیدہ در پوشندہ خطا

گر پسند خاطر ایشان فتد زان نکتہ
یاد فرمودہ فراموشم نسازند از دعا

گرچہ از دنیا بدل بی زارم اما این عیال
پای بندم کردہ تنگ زارند سوی مدعا

یارب از دنیا و ما فیہا مرا آزاد کن
سیما از صحبت اعدای دین مجتبیٰ

از طفیل احمد مختار و آل پاک او
از ہموم ہر دو عالم در امان داری مرا

ہم باصحاب کرامش کان چہار ارکان دین
یعنی آن شیخین و عثمان و علی مرتضیٰ

---

[1] بفضل اللہ تعالیٰ، در پنجسال تصنیف باتمام رسید۔ منہ۔

گفتگو ما مضی رنگ شکایت میدہد
دم مزن عبدالنبی خاموش از چون و چرا

مراجع و حواشی

[1] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، جلد سوم صباح الدین عبدالرحمن، ڈاکٹر پی۔ سرن کے مقالہ کا اقتباس صفحہ ۲۹۵-۲۹۶ [2] ایضاً صفحہ ۳۰۱ [3] اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب۔ جادوناتھ سرکار۔ صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۷۔ اورینٹ لانگ مین۔ ۱۹۷۹ء ایڈیشن [4] تاریخ شہابی۔ فارسی مخطوطہ۔ مولفہ قاضی شہاب الدین عثمانی احمد نگری، صفحہ ۸۵ [5] تاریخ احمد نگر دکن۔ مولفہ خان بہادر منشی عبدالقادر۔ مطبوعہ ۱۹۴۰ء صفحہ ۳۷۷ [6] ایضاً صفحہ ۳۷۸۔ اورنگ زیب اس وقت مرہٹوں کے خلاف مہمات میں مصروف تھا اور یہ فرمان اس نے موضع خواص پور تعلقہ سانگولہ ضلع شولاپور کے قیام میں تحریر کیا ہوگا [7] مہاراشٹراتی ہاساچی سادھنے (مراٹھی) مرتبہ وی۔ سی۔ بیندرے، جلد دوم صفحہ ۳۳۷ [8] تاریخ شہابی صفحہ ۱۱۱-۱۱۲ [9] نزہتہ الخواطر۔ مولفہ مولانا حکیم عبدالحئی لکھنوی جلد ۶ صفحہ ۱۷۹-۱۸۰، سن اشاعت ۱۹۹۲ء [10] مہاراشٹراتی ہاساچی سادھنے (مراٹھی) مرتبہ وی۔ پی۔ بیندرے، جلد سوم صفحہ ۴۱ [11] تاریخ شہابی کا یہ مخطوطہ جناب شیخ انصار الدین شیخ احمد۔ ٹکٹی دروازہ، احمد نگر کی تحویل میں ہے، انہیں سے قاضی عبدالنبی کی اولاد کا شجرہ حاصل ہوا [12] تاریخ احمد نگر دکن۔ مولفہ خان بہادر منشی عبدالقادر، مطبوعہ ۱۹۴۰ء [13] نزہتہ الخواطر۔ مولفہ مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھنوی، جلد ۶ صفحہ ۱۷۹-۱۸۰، سن اشاعت ۱۹۹۲ء [14] منطق کی مشہور کتاب شرح تہذیب پر حاشیہ کا ذکر مولانا ابوالعرفان ندوی نے بھی اپنے مضمون معقولات کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمات مشمولہ ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات۔ مرتبہ عماد الحسن آزاد فاروقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۶ء کے صفحہ ۴۷ پر کیا ہے [15] شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی، ولادت ۹۱۰ھ وفات ۹۹۸ھ۔

تلخیص و تبصرہ

جرمنی میں اسلام اور مسلمان

از

ضیاء الرحمٰن اصلاحی

جرمنی اور اسلامی ملکوں میں دوستی کے تعلقات ۱۷۳۱ء میں استوار ہوئے، اسی زمانے میں شاہ فریڈرک ولیم اول نے اپنے حفاظتی دستے کے لئے ترکستانی فوجی مقرر کئے، جب یہ مسلمان فوجی جرمنی آئے تو انہوں نے وہاں مسجد تعمیر کی۔ شاہ فریڈرک دوم کے دورِ حکومت میں ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہوگئی تھی۔ اب انہوں نے اپنے ایک امیر کا بھی انتخاب کیا۔ برلن کا قدیم قبرستان ان ہی کی یادگار ہے۔ گزشتہ صدی میں جرمنی باشندوں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات میں مزید اضافہ ہوا اور جرمن کے کچھ لوگ اسلام بھی لائے۔ جیسے محمد امین پاشا یا محمد علی وغیرہ۔ ان لوگوں میں نومسلم ہونے کی بنا پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا بڑا جوش و ولولہ تھا ان کی کوششوں سے اسلام سے مطالعہ کا شعف اور اسلامی تعلیمات سے واقفیت کا رجحان بڑھا۔ چنانچہ ۱۹ویں صدی میں قرآن مجید کے ترجمہ و تشریح کی کوششیں بھی شروع ہوگئیں اور پہلی دفعہ جرمنی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے مشہور شاعر جان والفنگ ون گوئٹے نے بھی قرآن مجید کا ایک ترجمہ کیا تھا۔

پہلی عالمی جنگ میں روس، جنوبی افریقہ اور سنغالیہ کے ۱۵ ہزار مسلمانوں کو

برلن کے قریب محبوس رکھا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں ایک اور نئی مسجد تعمیر ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں جرمن نژاد مسلمان باشندوں نے اپنی ایک تنظیم بھی برلن میں قائم کی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمنی میں مسلم جنگی قیدیوں کی تعداد ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ ان میں سے کچھ نے روس کے خلاف جنگ میں حصہ بھی لیا تھا۔ ان کی ضرورت کے اقتضا سے خود جرمن فوج نے برلن میں ایک مرکزی اسلامی ادارہ قائم کرنے کی اجازت انہیں دی تاکہ مسلم فوجیوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرسکیں اور یہ واقعہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں نے جرمن حکومت کے اشارے پر اپنی جانیں بھی قربان کردیں۔ ۱۹۴۴ء میں جرمنی میں مسلم طلبہ کا ایک فوجی اسکول بھی وجود میں آیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی کی بہتر معاشی حالت کی وجہ سے بڑی تعداد میں مسلمان وہاں تلاش معاش کے لئے آئے۔ اس صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں جرمن کے مسلمانوں کی بڑی تعداد ان ہی غیرملکی مسلم مہاجرین پر مشتمل تھی جو اکثر و بیشتر ترک تھے۔ ابتدا میں صرف مسلمان مردوں کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔ لیکن چند سال بعد اہل و عیال کو بھی لے آنے کی سہولت ہوگئی۔ اس کثرت تعداد کی وجہ سے کئی مسلم تنظیمیں قائم ہوگئیں اور مسلمانوں نے اپنے کو منظم کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان لوگوں کے جرمنی آنے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے ملکوں میں مذہبی تعصب کا شکار تھے۔ یا پھر ان کے ملکوں میں خانہ جنگی اور خونریزی تھی ان پناہ گزینوں میں زیادہ تر افغان اور فلسطینی یا کُرد تھے۔ ۹۰ کی دہائی میں کوسوا اور بوسنیا سے بھی مسلمان آنے لگے۔

جرمنی کے مسلمانوں کی موجودہ حالت اب جرمنی میں کیتھولک اور لوتھری عقیدے کے ماننے والے عیسائیوں کے بعد اسلام ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ ان دنوں وہاں ۳،۲ ملین

مسلم ہیں جن میں ۸۰ فیصد ترک ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت عقیدتاً اہل سنت والجماعت کی ہے
جرمنی میں اس وقت انجمنوں اداروں تنظیموں اور مسجدوں کی مجموعی تعداد تقریباً
۱۶۰۰ ہے۔ تنظیموں سے ۱۵ سے ۲۱ سال کی عمر کے ۴ لاکھ نوجوان وابستہ ہیں۔ موجودہ
مسلمانوں میں ہر دوسرے یا تیسرے مسلمان کی پیدائش جرمنی ہی میں ہوئی ہے۔ جرمن
نژاد مسلمانوں کے مقابلے میں دوسرے ممالک سے بغرض ملازمت آنے والے مسلمانوں کی
حالت نسبتاً زبوں ہے۔ مذہبی اور معاشی آزادی سے قطع نظر مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں
محدود ہیں، کیونکہ جرمن نسل کے لوگوں ہی کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ جرمنی کی سیاسی پارٹیوں
میں ان مسلمانوں کا عمل و اثر بہت محدود اور کم ہے۔

مسلمانوں کو درپیش مشکلات جن مسلمانوں نے جرمنی میں مستقل بود و باش اختیار
کرلی ہے گو دوسرے برادران ملک سے ان کے اجتماعی و سماجی تعلقات خوش گوار ہیں تاہم
عموماً ان کے تئیں تعصب کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ملازمتوں میں بھی ان کے ساتھ تفریق روا
رکھی جاتی ہے۔ بعض بعض قوانین بھی اسلامی احکام کی تعمیل میں مانع ہوتے ہیں، مساجد
کی تعمیر نو میں نوکر شاہی کا رویہ حائل رہتا اور دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ اسکولوں میں
اسلامی تعلیم کی سہولت بھی فراہم نہیں ہے۔

اسلامی ذبیحہ کو قانونی حیثیت نہیں دی گئی۔ اب تک جو مسلمان جرمنی کی شہریت
نہیں حاصل کر سکے ہیں۔ وہ حق رائے دہی سے محروم ہیں۔ حکومت دوسری قومیت دیئے
جانے پر غور کر رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی وجہ پامال روش ہے کہ مسلم ممالک کی خبریں منفی
انداز میں پیش کی جائیں۔ اسلام کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے جو غلط فہمیوں کا مجموعہ
ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اسلامی معاشرت میں عورتیں جابر مردوں کے قبضہ و تسلط میں گرد

ہوتی ہیں۔ اسلام اور اسلامی علوم سے واقفیت کا دعویٰ کرنے والے بھی حقائق سے
چشم پوشی کرتے ہیں اور اسلام کو دہشت گردی، خوں ریزی اور سفاکی کا مذہب قرار
دیتے ہیں، مسلمانوں کے جائز حقوق کے مطالبات کو انتہا پسندی گردانتے ہیں۔ ان پر
زور دیا جاتا ہے کہ اسلامی افکار و تصورات چھوڑ کر جرمن قوم کے عام رنگ میں رنگ
جائیں اور اپنے کو جرمن معاشرے میں ضم کر دیں۔

بیرون ملک سے آئے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت کم تعلیم یافتہ اور غربت کا شکار ہے
ان کے بچوں کی نشو و نما غریبی اور بدحالی میں ہوتی ہے اس کے اقتضا سے نوجوان جرائم کی
طرف راغب ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے مقصدِ حیات اور سمتِ سفر کا صحیح تعین نہیں کر پاتے
ظاہر ہے یہ اسلام کا نقص نہیں ہے بلکہ اس ماحول کا نتیجہ ہے جس میں وہ پلے اور بڑھے ہیں
اور ان کے والدین کو ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب موقع فراہم نہیں ہو سکا۔

تنظیمیں طرح طرح کی مخالفتوں اور رکاوٹوں اور جدید مغربی طرز معاشرت کے گہرے
اثر کے باوجود تمام مسلم تنظیمیں اور ادارے صحیح راہ پر گامزن اور مناسب طریقۂ عمل اختیار
کرنے کے لئے فکر مند رہتے ہیں! اور یہ امر کسی قدر باعثِ اطمینان بھی ہے کہ وہ سب متحرک
ہیں اور پاکیزہ ماحول قائم کر کے اسلامی تعلیم کو فروغ دینا چاہتے ہیں، مگر یہ کافی نہیں۔
نہایت افسوس اس کا ہے کہ دوسرے ایشیائی مسلم ملکوں کا عکس اس پر پڑنے لگا ہے یہی
وجہ ہے کہ ان میں اتحاد و اعتماد کا فقدان اور ہر جماعت کا یہ حال ہے کہ کل حزب بما لدیھم
فرحون۔ سب کے مطالبے اور مسائل یکساں ہیں۔ چنانچہ سب کا متفقہ مطالبہ یہی ہے کہ
جرمنی کے عام باشندوں جیسے حقوق اور سہولتیں مسلمانوں کو بھی فراہم کی جائیں لیکن اس کے
باوجود سب کے پلیٹ فارم الگ الگ اور طریقۂ عمل جدا جدا ہے۔ ہر تنظیم دوسری سے برسرپیکار

ہوتی ہے اور اپنے مطالبے منوانے سے زیادہ دوسری تنظیموں کے خلاف پروپیگنڈے میں اپنا وقت اور صلاحیت زیادہ ضائع کرتی ہے۔ بعض تنظیموں کے مقاصد نہایت حقیر ہوتے ہیں وہ محض معمولی فائدے حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کئی مسلم تنظیمیں ایسی ہیں جن کے پاس اپنی عمارت تو درکنار کوئی فنڈ بھی نہیں ہے۔ ان کو بیرونی ملکوں سے آنے والے مسلمانوں سے اس کا شکوہ ہے کہ وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے ملکوں کو بھیج دیتے ہیں۔ اس اختلاف و انتشار اور سقیم مالی حالت کی بنا پر جرمنی کے مسلمان وہاں کی حکومت پر مطلق اثر انداز نہیں ہو رہے ہیں۔

نظام تعلیم جرمنی میں تعلیم کا مسئلہ اس لئے اہم نہیں ہے کہ وہاں کے ہر بچے کے لئے اسکول جانا لازمی ہے۔ مالی پریشانی بھی اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ کیونکہ تعلیم کے اخراجات کی متکفل حکومت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہاں ناخواندگی کی شرح ایک فیصد سے بھی کم ہے اس کے باوجود ترکستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد غیر تعلیم یافتہ ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد اپنی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بچوں کے والدین جرمن زبان سے ناواقف ہیں۔ وہ اپنے بچوں سے جرمن میں بات چیت بھی نہیں کرتے، اس لئے ان کے بچے دوسرے جرمن بچوں کے مقابلہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں یہ کمی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اعلا درجات میں یہ مسلمان بچے بڑی کم تعداد میں پہنچتے ہیں۔ مذہبی تعلیم کا مطالعہ بھی کم نازک نہیں چند ادارے ہیں جو محنت اور خلوص سے اس کمی کی تلافی کے لئے کوشاں ہیں، خاص طور پر میونخ اور برلن جیسے بڑے شہروں میں اب کئی اسلامی اداروں کے زیر انتظام سیاست اور کمپیوٹر کے علاوہ قرآن اور عربی زبان کے موضوعات پر سمینار ہونے لگے ہیں۔ کہیں کہیں مساجد میں بھی دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ جس سے قرآنی و اسلامی تعلیم کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کچھ جماعتیں ایسی

بھی ہیں جو صرف اپنے ارکان پر ہی خاص توجہ دیتی ہیں۔ جرمنی کے پبلک اسکولوں میں مسلم بچوں کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ ہے۔ عیسائی بچوں کے لئے خواہ وہ کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ مذہبی تعلیم کی سہولت ہے۔ لیکن مسلمان بچوں کے لئے ایسی کوئی آسانی نہیں۔ ۸۰ کے دہے میں مسلم بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا ایک منصوبہ منظور ہوا تھا۔ مگر اس میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ مسلم بچے اپنی قومی اور ملکی زبان "ترکی" ہی میں اپنی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر دیگر ممالک کے مسلم طلبہ یا جرمن زبان بولنے والے مسلم بچے اس منصوبے سے خود بہ خود الگ ہو گئے۔ ۱۹۹۴ء میں جرمنی کے ایک اسلامک اسٹڈی گروپ کی جانب سے جرمن زبان میں مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم و تدریس کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ جس کے لئے یہ شرط قرار دی گئی کہ اس نصاب تعلیم پہ تمام مذہبی جماعتوں کا اتفاق ہو، یہ منصوبہ اپنے عمدہ مقاصد کے باوجود ابھی روبہ عمل نہیں ہو سکا ہے۔

نومسلم جرمنوں کی سرگرمیاں نومسلم جرمن اسلام لانے کے بعد اس کے بارے میں مکمل واقفیت حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ جرمن نژاد ہونے کی وجہ سے ان کی آواز قدرتاً دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں بلند اور زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ نومسلم جرمن مرد اور عورتیں اسلامی تعلیمات کے فروغ اور دوسرے دینی اسلامی بھائیوں سے تعاون میں زیادہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے جوش عمل نے بعض اسلامی تنظیموں کی کارکردگی میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اسلامی مقاصد کے حصول کے لئے یہ پرنٹ میڈیا اور اپنے اثر و رسوخ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ صحیح معلومات فراہم کرنا، تعلیم کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا، سمینار اور تربیتی کیمپوں کا انعقاد حتی کہ حج اور حجاج کے لئے آسانیاں پیدا کرنا ان کا خاص مشن اور محبوب مشغلہ ہے۔ اس سے ان کے خلوص، ایثار، عالی حوصلگی اور

لگن کا اندازہ ہوتا ہے۔ چلڈرن گارڈن کا مثالی انتظام اور شب و روز چلنے والے اسلامی اسکول کا قیام اور اسلامی اداروں میں شہریوں کے ملازمت کے مواقع پیدا کرنا انہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ وہ ایک اخبار "الاسلام" کے نام سے نکالتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کی بے روزگاری ختم کرنے کے علاوہ انہوں نے ایک MUSLIM HELFEN E.V رفاہ عام کمیٹی بھی قائم کر رکھی ہے۔ جرمن زبان بولنے والے ان مسلمانوں کی نشستیں بھی ہوتی ہیں جن کے مثبت نتائج بھی اب سامنے آنے لگے ہیں۔ یہ نشستیں اور اجتماعات تقریباً ۱۹۷۶ء سے ہو رہے ہیں۔ شروع میں سال بھر میں صرف ایک اجتماع ہوتا تھا۔ اب سال بھر میں یہ تین مرتبہ ہوتے ہیں۔ ان میں شرکت کے لئے جرمن زبان بولنے والے مسلمان ملک کے گوشے گوشے سے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سمپوزیم اور سیمینار میں حصہ لیتے ہیں۔ لوگ وقتاً فوقتاً کسی مسجد میں ہفتہ واری اجتماع بھی کرتے ہیں۔

اس قسم کے اجتماعات مقامی سطح پر بحث و مباحثہ کا مقبول ذریعہ بن گئے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کے معاملات پر غور و فکر اور ان کے مناسب حل کی سعی کی جاتی ہے اور مسلم معاشرے پر ان کا اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ان میں تعلیم اور دینی تعلیم کے فروغ کی ضرورت و اہمیت اور نصابی کتابوں کے تجزیے پر بھی بحث و گفتگو ہوتی ہے۔

اشاعت اسلام کے موانع

مسلم معاشرے میں اتحاد و یک جہتی کے فقدان کی وجہ سے دعوت و تبلیغ کے کام میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ بیرونی ملکوں کے مسلمان اپنے ہی ملکوں جیسی تنظیمیں یا اپنے ہی ملک کے خطوط و حالات کے مطابق جرمنی میں بھی دعوتی کام کا نقشہ بناتے ہیں۔ حالانکہ جرمنی کے حالات ان سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے نقشہ کار بنانے کے لئے ان کی رعایت ضروری ہے لیکن اس کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے

وہی مبلغین جو اپنے ملکوں میں کامیاب ہوتے ہیں، جرمنی میں آکر ناکام ہو جاتے ہیں جس کے بعد ان کی ساری سرگرمیاں کم اور تعطل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

جن ملکوں کے مسلمانوں کے طریقۂ کار میں بعد و اختلاف ہوتا ہے ان کے اختلافات یہاں بھی اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔ جس کا اثر دعوت پر نہایت خراب پڑتا ہے۔ جیسے ترکی کے دو قابل ذکر مسلم ادارے (ڈی آئی ٹی آئی بی) اور (ملی گورس) کے مابین تعلقات کشیدہ ہیں۔ ان میں اول الذکر ادارہ حکومت نواز ہے جب کہ موخر الذکر (ملی گورس) ترکی حکومت کا مخالف ہے۔ تاہم توقع کرنی چاہئے کہ اسلام کی دعوت کا مخلصانہ جذبہ جلد یا بہ دیر ان کی کشیدگی دور کر دے گا۔ جماعتوں کا دائرۂ کار اپنے حلقوں تک ہی محدود رہتا ہے جس سے دعوت اسلام کے مشن کو زیادہ وسعت و عمومیت نہیں مل سکتی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بیس سال سے بھی زیادہ عرصے سے کچھ مسلم جماعتیں جو وہاں "اسلام ہیٹ" اور "جین ٹرالریٹ ڈر مسلم" کے نام سے موسوم ہیں اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ بین المذاہب مذاکرے کی ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن یہ خواہش اب تک عملی جامہ نہیں پہن سکی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ جرمنی میں اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام خاطر خواہ طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہے اور اسلام اور اسلامی تعلیمات سے اس کی واقفیت بھی بہت کم ہے۔

حکومت اور اس کی مشنری بھی مسلمانوں پر من حیث القوم کوئی خاص توجہ نہیں دے رہی ہے، بلکہ وہ مسلم جماعتوں کو بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے لئے اس کو زیادہ مورد الزام بھی نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ اسے اسلام کی اصل روح و مفہوم کا پتہ نہیں اور وہ اسلام کی بنیادی معلومات بھی نہیں رکھتی۔ اس وقت اسلام مغربی دنیا کا موضوع بنا ہوا ہے۔

اس کی وجہ سے ہر ایک اس کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہے اور مسلمانوں کے جائز مطالبے کو بھی ملک کے دستور و آئین کے خلاف تصور کیا جاتا ہے اور اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے کی کوششوں کو جرمنی اتحاد کے لئے خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ ان مسلمانوں کو پسند کرتی ہے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جن کا طرز زندگی بھی عام جرمنیوں جیسا ہوتا ہے ان موانع وعوائق کے باوجود جرمنی میں دعوت کا کام ناممکن نہیں۔ سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ جرمنی میں معاشی طور پر مستحکم اور خود کفیل تنظیم کا قیام عمل میں آئے۔

غنیمت ہے کہ حکومت کو ثقافتی سرگرمیوں اور قومی طرز کے مذاکرات پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ دعوت و تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ و وسیلہ ہے۔

جرمنی کی اسلامی تنظیموں کی معاشی حالت اطمینان بخش نہیں۔ ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ امدادی رقوم ہیں۔ بعض تنظیموں کو کچھ اور منصوبوں کی تکمیل کے لئے بیرونی اور مشرق وسطی کے ممالک کا تعاون کبھی کبھی مل جاتا ہے لیکن یہ اور بعض مساجد سے ملحق دکانوں کے کرائے کی آمدنی بھی اس کام کے لئے کافی نہیں۔

تنظیم (مسلم ہلیفن ای وی) کی ماتحتی میں ایک ادارہ بنام خرید برائے تعاون مسلمانوں کی ضرورت کی بعض اشیا مہیا کرتا ہے جیسے پوسٹ کارڈ، حلال غذائیں، خوش خطی کے نمونے، قرآن مجید کی سی ڈی کیسٹیں یا نماز پڑھنے کے قالین وغیرہ، یہ اشیا زیادہ تر اسلامی ملکوں سے ہی درآمد کی جاتی ہیں، قالیچے افغانستان کے ان خاندانوں کے تیار کردہ ہوتے ہیں جن کو تنظیم کی جانب سے کپڑا بننے کی مشینیں فراہم کی گئی ہیں دعوت ایڈ ہلپ نامی ادارہ جرمنی میں قالین کی تجارت کرتا ہے اور اس طریقہ سے وہ افغان خاندانوں کے لئے سامان زیست فراہم کرتا ہے اور جو رقم ان اشیا کی فروخت کے بعد بچ رہتی ہے وہ دیگر فلاحی اور دعوتی کاموں میں صرف ہوتی ہے۔

(ماخوذ از "دعوہ" دسمبر ۲۰۰۰ء)

وفیات

جناب عبداللطیف اعظمی

افسوس ہے کہ ۱۰/مئی ۲۰۰۲ء کو اردو کے ممتاز اہل قلم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے عاشق وشیدائی جناب عبداللطیف اعظمی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ عرصے سے بیمار تھے گزشتہ سال نومبر میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو گردش روزگار کا یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ بلبل ہزار داستاں کی طرح ہر وقت چہکنے والا صم بکم بنا ہوا ہے، بیگم صاحبہ نے بڑی کوشش کی کہ کچھ بولیں مگر وہ ایک چپ ہزار چپ تھے۔

عبداللطیف اعظمی صاحب کی پیدائش یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو ہوئی، ان کا آبائی وطن بندی کلاں ہے جو مسلمان روسا اور زمینداروں کے مشہور قصبہ محمد آباد گہنہ سے چار پانچ کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے، پہلے تو یہ گاؤں اور قصبہ ضلع اعظم گڑھ ہی میں شامل تھے مگر چند برس قبل یہ ضلع مئو کا حصہ ہوگئے، اس کے بعد ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا اب آپ کہاں اعظمی ہیں؟

جناب عبداللطیف اسی گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبدالصمد ان کی پیدائش سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے، چار پانچ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ نے بھی جنت کی راہ لی۔ ان کی تعلیم و تربیت اور کفالت ان کے چچا شیخ حاجی عبدالحئی مرحوم نے اس طرح کی کہ ان کو اور ان کے دونوں بڑے بھائیوں یوسف امام مرحوم اور حاجی لطف الرحمان صاحب کو جو ابھی زندہ اور ہلدوانی (نینی تال) میں قیام پذیر ہیں اپنی یتیمی کا احساس نہیں ہوا۔

قدیم رواج کے مطابق مکتب کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۷/جولائی ۱۹۲۷ء کو انھوں نے اعظم گڑھ ضلع کی قدیم اور مشہور دینی درس گاہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں عربی کے پہلے درجہ میں داخلہ لیا پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ چلے گئے وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ۲۹/اگست کو جامعہ ملیہ جاکر فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ اس زمانہ میں جامعہ قرول باغ میں تھی ۱۹۴۱ء میں بی اے کر کے وہ مکتبہ جامعہ کے شعبہ تصنیف وتالیف وطباعت کے انچارج ہوئے اس کے بعد ان کی ذمہ داریاں تبدیل ہوتی رہیں مگر نہ جامعہ نے ان کو چھوڑا اور نہ انہوں نے جامعہ کو چھوڑا ایک مدت گزرنے کے بعد ۵۵ء تا ۵۷ء میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا اور پھر طویل عرصے کے بعد ۷۳ء تا ۷۵ء میں انہوں نے جامعہ سے اردو میں ایم اے کیا، اس کے بعد پی ایچ ڈی کے تحقیقی

مقالے میں لگے مگر اسے مکمل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

اعظمی صاحب کو مدرسۃ الاصلاح سے بڑا تعلق خاطر تھا، وہ جب وطن آتے تو کئی کئی روز یہ[اں] گزارتے، لکھنے پڑھنے کا ذوق یہیں کی طالب علمی کے زمانے میں ہوا، اس وقت یہاں مولانا امین اح[سن] اصلاحی مرحوم کا طوطی بولتا تھا، وہ بہت اچھے مقرر اور ممتاز اہل قلم تھے، عبداللطیف صاحب یہاں کے استاذوں میں ان سے زیادہ قریب تھے اور مولانا بھی ان سے بہت مانوس تھے مولانا ہی کی صحبت [...] عبداللطیف صاحب کو بولنے اور لکھنے کی اچھی مشق ہوئی، آگے چل کر ان کا یہ جوہر خوب نکھرا۔

مولانا کی سربراہی میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا اور ۱۹۳۶ء میں اس کا ترجمان الاصلاح نکلا [...] پریس قائم ہوا تو ان سب کاموں میں دور رہ کر بھی عبداللطیف صاحب نے بڑی دلچسپی لی، الاصلاح میں [...] کے کئی مضامین اور تحریریں شائع ہوئیں، ۱۹۳۹ء کے آخر میں الاصلاح بند ہوا تو انہوں نے دائرہ کی ایک [شاخ] قرول باغ میں قائم کی، جہاں سے اپنے اہتمام میں مولانا اصلاحی کی کتاب ''حقیقت نماز'' پہلی بار شائع [کی] اس کے دیباچے میں مولانا نے عبداللطیف صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے لئے یہ دعا بھی کی کہ ''[اللہ] تعالیٰ انہیں میرے دینی خیالات میں بھی میرا ہم نوا بنا دے''۔

مولانا امین احسن صاحب سے ان کے گہرے تعلق ہی کی بنا پر مولانا ابواللیث صاحب [نے] مرض الموت میں مجھ سے فرمایا کہ آج کل میں اپنے نام کے خطوط مرتب کر رہا تھا، مولانا امین احسن صا[حب] کے خطوط مرتب کر کے ان پر حواشی لکھ چکا ہوں، تم لطیف (۱) کو خط لکھ دو کہ وہ ان کی طباعت کا انتظام کر[دیں] میں نے اسپتال سے واپس آنے کے بعد ہی عبداللطیف صاحب کو خط لکھا مگر دوسرے ہی دن مولانا ابواللی[ث] صاحب سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

ندوۃ العلماء میں بھی وہ تقریر و تحریر میں اپنا جوہر دکھاتے رہے، یہاں طلبہ کی انجمن الاصلاح کے سکریٹری بھی تھے، جامعہ ملیہ میں تو ان کی گل افشانی گفتار دیدنی ہوتی تھی، تحریری مشغلہ بھی زور شور سے جا[ری] تھا، بی اے کی ڈگری کے لئے ''شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' کے عنوان سے ڈاکٹر عابد حسین کی نگرانی میں ایک مقالہ تحریر کیا جس کو بعد میں عابد صاحب کے پیش لفظ اور پروفیسر آل احمد سرور کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا تو اسے بہت پسند کیا گیا، سرور صاحب نے بھی اس کی بڑی داد دی تھی، اس کی اہمیت اس بنا پر بھی تھی [...]

(۱) مولانا اپنے خوردوں کو عموماً ''تم'' سے مخاطب کرتے تھے، عبداللطیف صاحب بھی عمر میں ان سے چھوٹے تھے، وہ جب ند[وہ] میں استاد تھے تو اعظمی صاحب اس وقت وہاں کے طالب علم تھے، عبداللطیف صاحب کو وہ لطیف ہی کہتے تھے اور جب سا[منے] ہوتے تو ''تم'' سے خطاب کرتے، اس میں بے تکلفی سے زیادہ ان کے لطف و شفقت کا دخل بھی تھا۔

معارف جولائی ۲۰۰۲ء

کہ اس وقت تک مولانا شبلی پر بہت کم لکھا گیا تھا، خود عبداللطیف صاحب بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔

طالب علمی کی اسی مشق اور شوق نے آگے چل کر انہیں اچھا اہل قلم، کامیاب مصنف و مؤلف اور ادیب، محقق اور نقاد بنایا، جامعہ آکر انہوں نے اردو ادب و تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، تحقیق میں وہ بڑی دقت نظر، خاص باریک بینی بلکہ نہایت موشگافی سے کام لیتے تھے، جزئیات پر پوری نظر رکھتے اور تفصیلات فراہم کرنے میں کوئی گوشہ اوجھل نہ ہونے دیتے، تحقیق میں اتنی محنت و دیدہ ریزی سے اسی لئے کام لیتے تھے تاکہ حقیقت و صداقت تک پہنچ کر اپنی نپی تلی رائے دے سکیں۔

آخر عمر میں وہ مشاہیر علم و ادب کی پیدائش و وفات اور واقعات و حوادث کی صحیح تاریخیں لکھنے پر بڑا زور دیتے تھے اور خود ہر وقت اسی چھان بین میں لگے رہتے تھے، وہ اپنی تحقیق میں تاریخوں کو بنیادی اور مرکزی حیثیت دینے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ ''اردو ادب میں تاریخوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے، اولاً تاریخوں کی طرف بالعموم توجہ نہیں کی جاتی اور اگر کسی نے کچھ توجہ کی بھی تو صرف سنہ لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ سنہ ہو یا تاریخ صحت کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا ہے''۔

ایک دفعہ میں نے مرحوم سید صباح الدین صاحب کے حوالے سے کہا کہ اگر کسی کی تاریخ پیدائش و وفات کچھ آگے پیچھے ہو جائے تو اس سے کیا قیامت آجائے گی، انہوں نے فوراً صباح الدین صاحب کی سنین کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں نے کہیں اپنا سنہ پیدائش ۱۹۱۳ اور کہیں ۱۹۱۴ لکھا ہے، پھر مدلل طور پر اس کے گوناگوں نقصانات بتائے۔

عبداللطیف صاحب نے ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں۔

(۲) سوشلزم (۳) امریکی عدالت عالیہ کے شاندار کارنامے (۴) بھارت آج اور کل (پنڈت جواہر لال کی کتاب کا ترجمہ) (۵) بابائے اردو مولوی عبدالحق (۶) ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت (۷) جواہر لال نہرو۔ ایک مطالعہ (۸) گاندھی جی اور ان کے خیالات (۹) سر سید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں۔ (۱۰) مولانا محمد علی۔ ایک مطالعہ (۱۱) مشاہیر کے خطوط اور ان کے مختصر حالات (۱۲) اقبال دانائے راز (۱۳) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ عظیم رہنما اور پہلے راشٹرپتی (۱۴) تیسرے راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۵) اردو ڈائرکٹری۔ موخر الذکر کتاب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اشتراک سے لکھی گئی ہے، کچھ کتابیں انہوں نے بچوں کے لئے بھی لکھی تھیں، ''اقبال دانائے راز'' بڑی کد و کاوش اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ اور اقبالیات میں اہم اضافہ ہے، خطوط پر ان کی کتاب بہت مقبول ہوئی۔

عبداللطیف صاحب ایک تجربہ کار اور مشاق صحافی بھی تھے، دراصل ادب کے کوچے میں اسی راہ سے داخل ہوئے تھے، ممکن ہے کہ مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلما کی طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے

قلمی رسالے نکالے ہوں لیکن وہ طلبائے جامعہ کے رسالے ''جوہر'' کے مدیر رہے۔ ان کی محنت و توجہ سے اس
کے بعض اعلیٰ معیار کے خصوصی نمبر نکلے۔ اس کے عبدالحق نمبر کی ملک میں بڑی پذیرائی ہوئی، ۴۳، ۴۴ء میں
ماہنامہ جامعہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے، ۴۸ء میں ڈاکٹر عابد حسین کی ادارت میں ہفتہ وار ''نئی روشنی'' نکلا تو
اس کے اسسٹنٹ و مینیجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے، یہ بند ہوا تو ۵۲ء میں ماہنامہ جامعہ ہمدرد خود ان کی ادارت میں
نکلا، ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ انجمن ترقی اردو ہند کے معیاری رسالے ''صبح'' کے مدیر رہے۔

رسالہ جامعہ ۱۹۴۷ء میں بند ہو گیا تھا، عبداللطیف صاحب کی تگ و دو سے وہ دوبارہ جاری ہوا
نومبر ۱۹۶۰ء میں جامعہ کے جشن چہل سالہ کے موقع پر دور ثانی کا پہلا شمارہ انہیں کی ادارت میں نکلا، چند بر
تک وہ تن تنہا بڑی محنت اور لگن سے اسے مرتب کرتے رہے، اس عرصے میں انہوں نے اس کے بعض خا
نمبر بھی نکالے، ان کی کاوش سے ملک کے کئی مشہور اہل قلم اس کے قلمی معاونین میں شامل ہوئے لیکن جب
ضیاء الحسن فاروقی صاحب کناڈا سے واپس آئے تو وہ اس کے مدیر اور اعظمی صاحب نائب مدیر ہوئے، فارو
صاحب اکثر بیان کرتے تھے کہ وہ نہ ہوتے تو میرے لئے رسالہ نکالنا بہت مشکل ہوتا، وہی ساری بھاگ دو
کرتے، خط و کتابت کر کے مضمون نگاروں سے مضامین حاصل کرتے، میں اسی لئے انہیں جوڑے ہو
ہوں، ان کے بغیر رسالہ وقت سے نہیں نکل سکتا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ اچھے مقرر تھے، ان کی طالب علمی کے زمانے میں مدارس اور دانش گاہو
میں ڈیبیٹ کا بہت رواج تھا، لطیف صاحب مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈیبیٹر بھی تھے، اس حیثیت سے بھی ان ک
یاد رکھا جائے گا، بحث و مباحثہ ان کی سرشت میں داخل تھا، اس میں ان سے پیش پانا اور انہیں شکست دینا بہت
مشکل تھا، وہ جب کسی موضوع پر بولنے لگتے تو چپ ہونے کا نام نہ لیتے، بعض بعض موضوعات پر گھنٹوں او
مہینوں بول سکتے تھے، ان کی بحثیں تقریر ہی تک محدود نہیں رہتی تھیں، بلکہ تحریروں میں بھی لوگوں سے ان کی
نوک جھونک رہا کرتی تھی، رسالوں اور اخباروں میں مراسلے بازی ان کا محبوب مشغلہ تھا، وہ کہتے تھے کہ ار
اخباروں میں کچھ نہیں ہوتا، میں صرف مراسلوں کی وجہ سے انہیں دیکھتا ہوں، اکثر میں تو یہ کالم ہی نہیں ہوتا، او
جن میں ہوتا ہے وہ نہایت کمزور اور پھس پھسا، جاندار مراسلے انگریزی اخباروں کے ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد پروفیسر ہمایوں کبیر نے انڈیا ونس فریڈم شائع کی تو مولانا کے ایک
مسترشد اور خاص عقیدت مند مولانا غلام رسول مہر نے اسے مولانا کی تصنیف ماننے سے انکار کیا، انہوں نے د
ہی ایک مضمون لکھے ہوں گے، لیکن ان کے جواب میں لطیف صاحب نے مضامین اور مراسلوں کا اتنا انبار
لگا دیا کہ مہر صاحب چاہے لاجواب نہ ہوئے ہوں، لیکن انہیں چپ ضرور ہو جانا پڑا۔ ایک مرتبہ اردو کے مشہور

محقق رشید حسن خاں نے کسی کتاب کو ایڈٹ کرتے ہوئے عش عش کو اش اش کردیا اور اسی کو صحیح املا قرار دیا تو
لطیف صاحب عرصے تک جامعہ اور ہماری زبان میں ان سے الجھے رہے، جامعہ ملیہ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور
پروفیسر مجیب لطیف صاحب کی کمزوری ہیں، ان تینوں سے ان کو بلا کی عقیدت تھی، اس لئے جہاں کسی نے اس
پر نکتہ چینی کی وہ فوراً اس سے بحث و تکرار شروع کر دیتے، مولانا عبدالماجد دریابادی ان تینوں پر اکثر ہفتہ وار
''صدق جدید'' میں اپنے مخصوص تنقیدی انداز میں نوٹ لکھا کرتے تھے۔ جن کا نہ ذاکر صاحب نے کبھی جواب
دیا اور نہ مجیب صاحب نے، مگر لطیف صاحب ان کی محبت میں ان کے علی الرغم مولانا کے سن و سال اور مرتبہ
و عظمت کی پروا کئے بغیر مراسلے لکھتے رہتے تھے، وہ جب مراسلے بازی پر آتے تو غالباً اسی وقت خاموش ہوتے
ہوں گے۔ جب خود اخبار والے گھبرا کر مراسلے چھاپنا بند کر دیتے ہونگے، ان کے مراسلے اگر جمع کر کے شائع
کئے جائیں تو ایک دلچسپ کتاب ہو جائے گی۔

عبداللطیف اعظمی صاحب پکے نیشنلسٹ اور کٹر کانگریسی تھے، یہ مدرسۃ الاصلاح، ندوۃ العلماء اور
جامعہ ملیہ کی تعلیم کا فیض ہوگا، کیوں کہ یہ تینوں ادارے اس وقت قومی تحریک اور آزادی کی جدوجہد کا مرکز تھے، اور
ان کے اکثر وابستگان کا تعلق کانگریس سے تھا، شروع میں چاہے وہ اپنے بزرگوں اور استاذوں کے اثر سے کانگریسی
رہے ہوں مگر بعد میں علی وجہ البصیرت اس راہ پر گامزن ہوئے اور اس سے کبھی منحرف ہونا پسند نہیں کیا۔

لطیف صاحب علمی کی طرح عملی آدمی بھی تھے، وہ جس قدر انہماک سے تصنیف و تالیف کا کام
کرتے تھے، اسی قدر توجہ اور دلچسپی سے انتظامی اور دفتری کام بھی انجام دیتے تھے، جامعہ میں ان کا تعلق ہمیشہ
انتظامیہ سے رہا، اور وہ مختلف انتظامی شعبوں سے وابستہ رہے، آخر میں وہ شیخ الجامعہ کے پرسنل مددگار اور پھر
سکریٹری مقرر ہوئے، لیکن یہ مشاغل اور ذمہ داریاں ان کے تصنیف و تالیف کے کام میں حارج نہیں ہوئیں،
وہ اپنے گھر، دفتر اور کتب خانے میں ہمیشہ کتابوں اور رسالوں میں گھرے رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی علمی، تحقیقی
اور ادبی گتھی سلجھانے میں لگے رہتے تھے۔

۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی گولڈن جبلی کے انعقاد کا اعلان ہوا تو ان کی انتظامی
صلاحیت کی بنا پر جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انہیں کچھ پہلے ہی یہاں بلا لیا تھا، اس وقت
انہوں نے واقعی ان کا بڑا تعاون کیا، اور اپنے حسن انتظام کی دھاک بیٹھا دی، اسی لئے ۱۹۸۲ء میں ''اسلام اور
مستشرقین'' کے سمینار کے انتظام کے لئے بھی انہیں کچھ پہلے بلایا گیا، مگر اس دفعہ میں نے دیکھا کہ صبح سے شام
تک وہ کتابوں کی نمائش کے کمرے میں معارف کی جلدوں کے سامنے بیٹھ کر ان سے نوٹ تیار کرتے رہتے
تھے، کبھی کبھی جب سید صباح الدین صاحب ادھر آ کر انہیں اس انہماک سے پڑھنے لکھنے میں مشغول دیکھتے تو

دیکھتے تو کہتے جناب والا اس وقت علم و تحقیق کا لبادہ اتار کر صرف سمینار کی کامیابی کی فکر کیجیے، مگر وہ ہوں بار کہہ کر اپنے کام میں مشغول رہتے، اس لحاظ سے دیکھیے تو ان میں بری جامعیت تھی، وہ اچھے مقرر اور اچھے کہنے والے بھی تھے، لائبریری اور دفتر کا کام بھی سلیقے سے کرتے تھے، شیخ الجامعہ کے اچھے پرسنل اسسٹنٹ اور سکریٹری بھی تھے اور اچھے صحافی اور پبلک ریلیشنز افسر بھی تھے اور پریس اور مکتبہ کے کام بھی خوش اسلوبی سے کر لیتے اور اپنے منصبی کاموں کے ساتھ دوسرے گوناگوں کام بھی کرتے رہتے تھے، وہ کئی برس تک انجمن ترقی اردو ہند کی جامعہ نگر شاخ کے سکریٹری تھے، اور اسی حیثیت سے رسالہ ''صبح'' کے برسوں مدیر رہے۔

عبداللطیف صاحب بڑے چاق، چوبند، مستعد، تر و تازہ اور شگفتہ رہتے تھے، ان کی امنگ اور حوصلہ و نشاط میں کبھی کمی نہیں دکھائی دیتی تھی، عزم، ارادے اور دھن کے پکے تھے، ساٹھ ستر برس کی عمر میں نہایت جوش و ولولہ سے کام کرتے رہتے تھے اور ان پر کبھی تھکن اور اضمحلال طاری نہیں ہوتا تھا، ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی، ایک خوش حال گھرانے سے ان کا تعلق تھا اور ان میں بڑی صلاحیتیں تھیں، لیکن اپنی علم دوستی کی بنا پر انہوں نے جامعہ کی فقیرانہ زندگی اور بوریہ نشینی کو ترجیح دیا، انہوں نے اپنے بعض اساتذہ کی طرح یہاں بڑی سخت زندگی گذاری مگر ہر حال میں خوش و خرم اور اپنے کام میں مگن اور منہمک رہے۔

فرائض منصبی کے علاوہ جو کام اپنے شوق و ذوق سے کرتے تھے، اس کے صلہ و معاوضہ کے خواہش مند نہ ہوتے، حرص و طمع کے بجائے طبیعت میں استغنا اور بے نیازی تھی، خودداری اور غیرت کا یہ حال تھا کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں بڑا عار محسوس کرتے تھے، طالب علمی میں گھر والوں سے اخراجات طلب کرنے میں بڑا تکلف و تامل ہوتا تھا، بی اے کرنے کے بعد کسی ملازمت کے لئے ذاکر صاحب سے ملنے سے انکار کر دیا۔

لطیف صاحب کا حلقۂ تعارف بڑا وسیع تھا، جامعہ اور دہلی والوں کی طرح پورے ملک کے علمی و ادبی حلقوں سے ان کا رابطہ رہتا تھا مگر ان تعلقات کو انہوں نے کبھی فرائض منصبی میں حائل نہیں ہونے دیا، وہ جامعہ میں جن عہدوں پر فائز تھے، چاہتے تو اپنے عزیزوں اور اہل تعلق کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے، وہ تین وائس چانسلروں سے منسلک رہے، لیکن نہ کبھی خود فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے دیا، وہ کسی کی سفارش تک نہیں کرتے تھے، حالانکہ وائس چانسلر حضرات ان پر پورا اعتماد کرتے تھے مگر انہوں نے ان کے اعتماد کو نبھایا اور اس سے فائدہ اٹھانے کو ایمان داری اور دیانت کے خلاف سمجھا، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ نہ جامعہ کا مفاد پس پشت ہو اور نہ اہل جامعہ سے تعلقات خراب ہوں، اس کے باوجود جامعہ کے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں کو اس کی شکایت رہتی تھی کہ وہ شیخ الجامعہ کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے نہایت سخت گیر تھے، ان سے کسی کو ملنے نہیں دیتے تھے، اپنی بیوی اور مجیب صاحب کی بیوی کو بھی ان سے دفتر میں ملنے نہیں دیا، ممکن ہے ان روایتوں میں بہت کچھ مبالغہ ہو، تاہم یہ لطیف صاحب کے اصول پسند ہونے کا ثبوت ہے، اگر وہ سخت گیری سے کام نہ لیتے تو ہر کس و ناکس وائس چانسلر کو تنگ کرتا، وہ یہ سخت رویہ اسی لئے اختیار کرتے تھے کہ شیخ الجامعہ پوری یکسوئی اور انہماک سے اپنے فرائض انجام دے سکیں، علاوہ ازیں اس کے بغیر مجیب صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں جو مضامین اور کتابیں لکھی ہیں اور جن کو وہی لکھ سکتے تھے، کیسے لکھ سکتے تھے۔

ان میں تکلف اور بناوٹ نام کو بھی نہ تھی، جن لوگوں سے ملنے جلنے کا جو انداز پہلے تھا، وہی ہمیشہ رہا، وہ اپنے خوردوں سے بھی بے تکلفی سے ملتے تھے، اس کی وجہ سے وہ ہر طبقے میں مقبول تھے، کسی کو نفرت و حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے، ان میں فخر و غرور کا شائبہ نہ تھا، ہمیشہ صبر و قناعت کے خوگر رہے، جامعہ کی قلیل تنخواہ میں بڑی صاف ستھری اور سلیقے کی زندگی گذارتے تھے، کفایت شعار تھے، فضول خرچی کو پسند نہیں کرتے تھے عموماً پوسٹ کارڈ پر خط لکھتے تھے کہ جب پوسٹ کارڈ سے کام چل جاتا ہے اور اسی میں ساری باتیں آجاتی ہیں تو لفافے لے کر زیادہ پیسے کیوں خرچ کئے جائیں، ان کا خط بہت اچھا اور پاکیزہ ہوتا تھا۔

دہلی میں وہ ہمیشہ بسوں پر سفر کرتے تھے، حالانکہ وہاں بس کا سفر سب کے بس کی بات نہیں، لیکن وہ طویل العمری میں بھی بس پر بے تکلف سوار ہو کر اس کے ہر گلی کوچے کی خاک چھانتے تھے، ان کو دہلی اور نئی دہلی کے سب ہی ادبی، علمی اور ثقافتی جلسوں اور تقریبوں میں شریک ہونا پڑتا تھا، اپنے دفتری اور خانگی کاموں سے بھی جامعہ نگر سے باہر نکلنا پڑتا تھا، اس لئے پاس بنوا لیا تھا، ایک دفعہ ان سے اس پر بات ہو رہی تھی تو کہنے لگے کہ کسی دن سنو گے کہ بس سے چڑھتے اترتے میری موت ہو گئی۔ ایک دفعہ انجمن ترقی اردو کے کسی سمینار میں ملے تو میں نے عرض کیا، آج آپ کے ساتھ میں بھی بس میں جامعہ نگر جاؤں گا، انہوں نے کہا آج تو میں شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ کی گاڑی سے جاؤں گا، میں نے کہا، یہ خلاف معمول کیسے؟ کہنے لگے، شاہد صاحب کے اصرار کو ٹال نہ سکا۔

ایک مدت تک وہ دہلی میں کرایے کے مکان میں رہے، آخر عمر میں گاؤں کی کچھ زمین نکال کر وہاں ایک مکان تعمیر کرایا، جو اب مہمانوں سے بھرا رہتا تھا، وہ بڑے مہمان نواز تھے، مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے یہاں کیوں نہیں رکتے، کسی روز دن میں ملنے جاتا تو اصرار کر کے دوپہر کا کھانا کھلاتے۔

وہ بے ضرر شخص تھے، کسی کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت ان میں نہ تھی، اپنے بدخواہوں کا بھی برا نہ چاہا، ہر شخص سے ان کی بحث و تکرار ہوتی جس میں ناگفتنی اور سخن گسترانہ باتیں بھی ہوتی تھیں، لیکن وہ خفا نہ

ہوتے اور اگر کبھی بگڑ بھی گے تو سنبھلنے میں دیر نہ لگتی، وہ دیر تک نہ کسی سے ناراض رہتے تھے، اور نہ کینہ کپٹ رکھتے
جن لوگوں سے چوکھی لڑائی رہتی تھی، ان کا ذکر کبھی نامناسب انداز میں نہ کرتے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے (آمین) "ض"

جناب کیفی اعظمی

مشہور و مقبول ترقی پسند اور اردو کے انقلابی شاعر جناب کیفی اعظمی ۱۰ مئی کو صبح ساڑھے چھ بجے ممبئی کے جس لوک اسپتال میں انتقال کر گئے جہاں سانس کی تکلیف کی وجہ سے دو ماہ پہلے داخل ہوئے تھے، ۱۱ مئی کو اندھیری ویسٹ کے چار بنگلہ قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

کیفی صاحب ۱۹۱۸ء میں اعظم گڈھ کی تحصیل پھول پور کے ایک گاؤں مجواں کے زمیندار شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد جناب سید فتح حسین رضوی اودھ کی ریاست بلہرا میں تحصیلدار تھے، کیفی صاحب کا اصلی نام سید اطہر حسین رضوی تھا، یہ سات بھائی بہن تھے، بڑے بھائیوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، ان کو ان کے والد بزرگوار نے عربی تعلیم دلانے کے لئے فرقہ شیعہ کی مشہور درس گاہ سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کرایا مگر ان کا جی یہاں نہیں لگا، غالباً مدرسے کی سخت گیری اور مذہبی شدت پسندی سے گھبرا کر انہوں نے تعلیم ہی نہیں چھوڑی بلکہ مذہب سے بھی برگشتہ ہو گئے، اور غالباً آخر تک رہے، تاہم مدرسہ کی تعلیم کو خیرباد کہنے کے باوجود انہوں نے لکھنؤ اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں سے مشرقی امتحانات دیئے اور اپنی ذاتی محنت و مطالعہ سے اپنی استعداد بڑھائی، اردو و فارسی کے علاوہ غالباً وہ عربی، ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔

کیفی اعظمی کا طرۂ امتیاز ان کی شاعری ہے، جس کو اس کے مخصوص لب ولہجہ، باغیانہ تیور اور انقلابی افکار وخیالات کی بنا پر بہت پسند کیا گیا، ان کے گھر میں پہلے ہی سے شعر وسخن کا چرچا تھا، اردو ہی نہیں فارسی کا ذوق بھی عام تھا، ان کے تینوں بڑے بھائی بھی شاعری کا مذاق رکھتے تھے اور صاحب بیاض تھے، خاندانی کتب خانے میں اردو، فارسی اور عربی شعراء کے دواوین تھے جو بچپن ہی سے ان کے مطالعے میں رہتے تھے، اس شاعرانہ ماحول میں وہ ۱۱ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے، شاعری میں انہوں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، ان کا ذوق ہی ان کا اصلی راہبر تھا، تاہم لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کی ادب پرور صحبتوں سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا، کیفی صاحب نے ابتدا روایتی شاعری سے کی، شروع میں حسن وعشق اور گل وبلبل کے قصوں میں الجھے مگر جب وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ تبدیل ہو گیا اور روایتی شاعری کا کوچہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

عنفوان شباب میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن ہو گئے تھے، وہ کچھ عرصے کان پور میں بھی رہے تھے، جہاں مزدور سبھا کے کارکنوں کا ساتھ ہو گیا تھا، ان لوگوں نے چوری چھپے انہیں کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر دینا شروع کیا خود کیفی صاحب کا بیان ہے کہ "انہیں اب وہ راستہ مل گیا جس پر انہوں نے زندگی کا سفر طے کیا ہے اور باوجود مفلوج ہو جانے کے اب تک اسی راستے پر چل رہا ہوں، ایک دن اسی راستے پر گروں گا اور سفر ختم ہو جائے گا، منزل پر یا منزل کے قریب" کمیونزم پر ان کا اعتقاد اس قدر مستحکم اور راسخ تھا کہ سوویت روس کے بکھرنے کے بعد بھی اس میں تزلزل پیدا نہیں ہوا، وہ عمر بھر اشتراکیت کے مبلغ رہے اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانیاں دیں، ان کے اثر سے ان کا پورا خاندان بیوی (۱) بچے سب ہی اس تحریک کا دم بھرتے تھے، ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینے کی بنا پر دو بار جیل گئے۔

اردو کی ترقی پسند تحریک سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا اور وہ اس کے اہم ستون خیال کئے جاتے تھے۔

اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری عارض وکاکل کی حکایت اور گل و بلبل کا تذکرہ نہیں رہی بلکہ وہ اپنے دردمند دل کی داستان سنانے اور زندگی اور سماج کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور اس طرح کے غزلیہ اشعار کہنے لگے۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں تو مل جائے نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

ان کے نزدیک زندگی جہد و جہاد بن گئی۔

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

اب انہیں غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہونے لگا، اس لئے سیاسی، سماجی اور انقلابی نظمیں لکھ کر قوم میں باغیانہ اور احتجاجی خیالات کی پرورش کرنے لگے، ان کی نظموں میں بڑی گھن گرج، جوش وخروش اور روانی تھی، ان کے پڑھنے کا انداز بھی بڑا انوکھا اور منفرد تھا، جس سے وہ عجیب ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے سامعین کو مرعوب ومسحور کر دیتے تھے، راقم کو مشاعروں میں بھی انہیں سننے کا کئی بار اتفاق ہوا اور دارالمصنفین کی مخصوص صحبتوں اور نشستوں میں بھی، ان کی آواز میں غضب کا جادو اور لہجہ میں بڑا رعب واثر تھا، ان کی شاعری درد وگداز اور سوز واثر کا مرقع ہوتی تھی۔

اب ان کا قلم مجبوروں، مظلوموں اور مراعات سے محروم طبقوں کے لئے وقف ہو گیا تھا، ان کی

(۱) کیفی صاحب ۱۹۴۷ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے حیدرآباد گئے اور مشہور ترقی پسند جناب اختر حسن مدیر "پیام" کے یہاں قیام کیا، یہیں ان کی سالی شوکت خانم سے کیفی صاحب کی ملاقات ہوئی، اس کے بعد جلد ہی وہ ان کے حبالہ عقد میں آگئیں اور زندگی بھر ان کی ہم نوا اور دم ساز بنی رہیں۔

شاعری مساوات، ہمدردی اور قومی ایکتا، انصاف، جمہوریت اور انسان دوستی کا پیغام بن گئی غ
غریبی، مفلسی، فرقہ پرستی اور فسطائیت کے خلاف احتجاج کرنا ان کا شیوہ ہوگیا تھا اور وہ مزدوروں، کسانوں
کمزوروں کے وکیل اور ترجمان ہوگئے تھے۔

کیفی صاحب کی شعری تصانیف کے نام یہ ہیں:

جھنکار، آخرِ شب، آوارہ سجدے، سرمایہ، میری آواز سنو (فلمی نغموں کا مجموعہ) ابلیس کی مجلس ش
(دوسرا اجلاس)

ان کی جن نظموں کو بڑی شہرت و قبولیت نصیب ہوئی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:
اندیشے، زندگی، ایک لمحہ، ابن مریم، بہروپنی، عورت، رام کا بن باس، تلنگانہ، مکان وا
موخر الذکر کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے — آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی۔
سب اٹھو میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو — کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی۔

ان کے بعض اور اشعار بھی دیکھئے:

اعلان حق میں پھنس گیا دار و رسن تو کیا — لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد
انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں — دو گز زمیں بھی چاہئے دو گز کفن کے بعد

بنور لیا یہ شہر ستم گر کے ہوگئے — دیکھا جو مڑ کے ہم نے وہ پتھر کے ہوگئے

شور یوں ہی نہ پرندوں نے مچایا ہوگا — کوئی جنگل کی طرف شہر سے آیا ہوگا

جناب کیفی کو نثر نگاری کا بھی اچھا سلیقہ تھا، وہ بڑی خوبصورت اردو نثر لکھتے تھے، شروع میں کمیونس
پارٹی کے اردو روزنامہ "جنگ" میں کام کیا تھا، ایک زمانے میں ہفتہ وار "بلٹز"، ممبئی میں "نئی گلستاں"
عنوان سے طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھتے تھے، جن میں موجودہ سیاسی و سماجی مسائل کا تذکرہ ہوتا تھا، ان کا کلما
کالم یوما گری میں دو جلدوں میں چھپ گیا ہے، آخر عمر میں وہ کبیر پر بھی کام کر رہے تھے، جب مجھ ان تقر
لاتے تو اس کے مواد کی تلاش میں دارالمصنفین بھی آتے، کبیر پر ہندوستانی اکیڈمی کی کتاب کو وہ استفاد
کے لئے دارالمصنفین سے کئی بار اپنے گھر لے گئے، وہ اچھے ڈرامے بھی لکھتے تھے۔

کیفی صاحب میں تقریر کا ملکہ خداداد تھا، بڑے اچھے مقرر تھے، مجمع کو قابو میں کر لینے میں ان کو کا
حاصل تھا، ایک مرتبہ سرحد کے سرسید انٹر کالج کے جلسے میں وہ اور میں دونوں مرحوم ڈاکٹر محمد طاہر لکچرر شبلی کا

ان کی طبیعت خراب تھی، منتظمین کو اندیشہ تھا کہ وہ تشریف نہیں لاسکیں گے مگر کیفی صاحب
کی دعوت پر گئے تھے، ان کی طبیعت خراب تھی، منتظمین کو اندیشہ تھا کہ وہ تشریف نہیں لاسکیں گے مگر کیفی صاحب
ی دعوت پر گئے تھے، علالت کے باوجود تشریف لائے، معذرت کی کہ انہیں زحمت نہ دی جائے مگر لوگ کہاں
ودے کے پکے تھے، ان سے پہلے میری تقریر ہوئی، میں نے اپنی تقریر جلد ہی ختم کرتے ہوئے کہا کہ کیفی صاحب
ماننے والے تھے، ان سے پہلے میری تقریر ہوئی، میں نے اپنی تقریر جلد ہی ختم کرتے ہوئے کہا کہ کیفی صاحب
کی موجودگی میں مجھے لمبی گفتگو کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس لئے میں آپ کے اور ان کے درمیان حائل
نہیں ہونا چاہتا، اس سے ان کو تھوڑی آزردگی ہوئی مگر وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور بیماری اور طبیعت
کی بے کیفی کے باوجود بڑی وجد آفریں اور پراثر تقریر کی۔

فلم سے تعلق کی بنا پر بھی انہیں پورے ملک میں شہرت ملی، ہندوستانی فلموں کو انہوں نے دل و دماغ
کو مسحور کر دینے والی اپنی گیتوں سے مالا مال کیا، انہوں نے اپنے وقت کی بعض کامیاب فلموں کے لئے جو گانے
لکھے، ان سے اب تک لوگ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

ہندوستانی فلموں کے گانوں کا معیار بہت پست اور بازاری ہے، لیکن کیفی اور ان کے معاصر نغمہ
نگاروں شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی اور جاں نثار اختر وغیرہ کی فلمی دنیا سے وابستگی سے
چاہے ان کی شاعری کا نقصان ہوا ہو لیکن انہوں نے فلمی نغموں میں سوقیت اور ابتذال کو نہیں آنے دیا کیوں
کہ انہوں نے کم درجہ کے شعرا اور گیت لکھنے والوں کی طرح فلم بینوں کے ذوق اور پسند و ناپسند کو معیار بنانے
کے بجائے ان کے ذوق و پسند کو اپنے اعلا مذاق سے ہم آہنگ بنایا اور اپنے بلند معیار کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

کیفی صاحب کی ادبی خدمت کا ایک میدان ڈرامہ نگاری بھی ہے، انہیں اس سے بڑی دلچسپی تھی
اور اس کا بہت ملال تھا کہ آغا حشر کے سوا کسی نے اس فن کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی، وہ انڈین پیپلز تھیٹر
ایسوسی ایشن کے تاسیسی اور فعال رکن تھے اور بعد میں اس کے صدر بھی ہوگئے تھے، اس سوسائٹی کی طرف
سے پرتھوی تھیٹر میں اچھے اور مقبول ڈرامے اسٹیج کئے گئے اور انہوں نے خود بھی اس کے تحت "آخری شمع" کے
عنوان سے مرزا غالب کے کردار پر ایک ناٹک لکھا تھا۔

کیفی صاحب نے اردو شعر و ادب اور زبان کی گوناگوں خدمت انجام دی، ان کی خدمات کا پورا
اعتراف کیا گیا، بڑے بڑے مشاعروں اور ادبی و تعلیمی جلسوں میں وہ مدعو کئے جاتے تھے، اور ان کی بڑی
پذیرائی کی جاتی تھی، اکثر ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں نے اپنے بڑے سے بڑے انعامات دیئے، دلی سرکار
اور اردو اکادمی کا ملینیم ایوارڈ ابھی حال میں ان کو ملا تھا جو گیارہ لاکھ روپے کا تھا، غالباً اس سے بڑا ایوارڈ ابھی
تک اردو کے کسی شاعر یا اہل قلم کو نہیں ملا ہے، حکومت کے پدم شری اعزاز کو اس کے اردو کے ساتھ معاندانہ د

متعصبانہ رویے کی بنا پر احتجاجاً قبول نہیں کیا۔

کیفی صاحب بڑے ظریف وطباع، نہایت شریف، خوش خلق، ملنسار اور ہمدرد وغم گسار شخص تھے، وہ کمزور طبقوں کے دکھ درد سے تڑپ اٹھتے تھے ان کی شاعری مزدوروں کسانوں اور سماج کے دبے کچلے طبقوں کے احساسات وکیفیات کا مرقع ہوتی تھی، سماجی وفلاحی کاموں سے شغف تھا، بمبئی کی اکثر تحریکوں سے وابستہ رہے، اپنے گاؤں سے ان کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا، زندگی کے آخری ایام اکثر یہیں گزارے اور گاؤں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے گوناگوں کام انجام دیئے، اپنے بنگلہ کے علاوہ باغ، سڑک اور اسکول قائم کیا، اپنی تمام کتابیں اس کے لئے نذر کردیں، ملینیم ایوارڈ کی زیادہ رقم گاؤں کی ترقی میں لگادی۔

وہ عزم واستقامت کا پیکر تھے، جس نظریے سے وابستہ تھے، اس پر ہمیشہ مضبوطی سے قائم رہے، ناموافق حالات میں بھی اس سے ان کا رشتہ کمزور نہیں ہوا، ان کی قوت ارادی غضب کی تھی، کبھی پست ہمت اور کم حوصلہ نہ ہوتے، پچیس تیس برس سے مفلوج ہوگئے تھے، اس کے باوجود وہ مسلسل سفر کرتے رہتے تھے، کسی تقریب اور پروگرام کی شرکت میں ان کی معذوری ومجبوری حائل نہ ہوتی، ملک بھر کے مشاعروں میں بے تکلف پہنچ جاتے، لکھنے پڑھنے کا کام برابر جاری رہتا تھا، مشکل سے مشکل کام اپنے ذمہ لے لیتے اور اس کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہتے، اعظم گڈھ سے بمبئی کے لئے گاڑی چلانے اور اپنے گاؤں کے قریبی اسٹیشن پھول پور میں اسے رکوانے میں بڑی جدوجہد کی۔

کیفی صاحب کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف یا نقصان نہیں ہوا ہوگا، وہ ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن طالب علمی کے زمانے ہی میں انہیں مذہب سے توحش ہوا اور اپنے قلب وروح کی تسکین کا سامان کمیونزم میں ملا جس پر ان کی استواری آخر تک رہی مگر اپنی طبعی شرافت کی بنا پر وہ مذہبی لوگوں سے بھی راہ ورسم رکھتے تھے اور کبھی ان کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ ان جیسے ذہین اور دیدہ ور شخص پر اصل حقیقت منکشف نہیں ہوئی، کاش وہ مزید غور وفکر سے کام لیتے تو گوہر مراد ضرور ان کے ہاتھ آجاتا مگر جگر مرادآبادی نے سچ کہا ہے:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

"ض"

مولوی محمد مسعود خاں

افسوس ہے کہ ۳؍ جولائی ۲۰۰۲ء کو مشہور قومی کارکن مولوی محمد مسعود خاں ایک سڑک حادثے میں دہلی میں وفات پاگئے، وہ ایک دین دار گھرانے کے فرد تھے، ان کے بڑے بھائی مولانا محمد سعید خاں شبلی نیشنل اسکول میں مولوی اور سلسلۂ نقش بندیہ مجددیہ کے شیخ طریقت تھے، جن کی ذات سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا، مسعود خاں صاحب نے شروع میں دینی تعلیم حاصل کی، پھر بی۔اے ایل ایل بی کرکے اعظم گڈھ کی کلکٹری کچہری میں وکالت شروع کی۔

قوم وملت کی خدمت کی جانب ان کا طبعی میلان تھا، اس لئے وکالت کے ساتھ اپنے جدید وطن منگراواں کے مکتب کو عربی مدرسہ کی شکل دے دی، ہر سال گرمیوں میں اس کے جلسے کراتے جن میں جمعیۃ علمائے ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ بھی تشریف لاتے تھے۔

جمعیۃ علما سے تعلق کے باوجود وہ کانگریس سے اس کے متعصبانہ اور مسلم دشمن رویے کی بنا پر سخت بیزار تھے، اسی لئے مسلم مجلس میں شامل ہوگئے تھے، لیکن ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کے انتقال کے بعد اس کے حصے بخرے ہوگئے، تو انہوں نے چودھری چرن سنگھ کی پارٹی کا انتخاب کرلیا اور وفات تک اسی کے ساتھ تھے، اس وقت لوک دل (اجیت) کی ریاستی شاخ کے صدر تھے، ان میں بڑی تنظیمی صلاحیت تھی اور وہ ایک ایماندار اور عملی آدمی تھے، اس کی وجہ سے پارٹی میں ان کا وزن تسلیم کیا جاتا تھا، اس کے ٹکٹ پر وہ کئی بار یو۔پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، پھر راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، اس وقت بھی یوپی کونسل کے ممبر تھے۔

۱۹۷۷ء میں مسٹر رام نریش یادو کی سربراہی میں اتر پردیش میں جنتا پارٹی کی حکومت بنی تو مسعود خاں پی۔ڈبلو۔ڈی منسٹر ہوئے اور گوناگوں سماجی اور فلاحی کام کئے اور پوری ریاست میں سڑکوں کا جال بچھا دیا، وہ علمائے دین اور بزرگوں سے بھی تعلق رکھتے تھے، وزیر ہونے کے بعد جب پہلی دفعہ مولانا علی میاں سے ملاقات کے لئے گئے تو کہا کہ خدمت کا کوئی موقع دیجئے، مولانا نے فرمایا کہ کئی آدمیوں سے کہا کہ رائے بریلی سے تکیہ کلاں میری قیام گاہ تک آنے والی سڑک بنوادیں، سب لوگ ہاں ہاں کرکے چلے جاتے ہیں مگر ابھی تک وہ نہیں بنی، آپ سے بھی اسی کی درخواست ہے، مسعود صاحب نے کہا آپ کب رائے بریلی جائیں گے، مولانا نے کوئی تاریخ بتائی تو انہوں نے کہا انشاء اللہ اس وقت تک بن جائے گی، چنانچہ واقعی بن گئی۔

ان کی وزارت کے زمانے میں ایک وفد میں ان کے آفس میں ملا، اس ملاقات کی یہ بات اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے، "یہاں آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ پورا ہندوستان بے ایمان ہوگیا ہے"۔

میرے علم و واقفیت کے مطابق دریا میں رہتے ہوئے بھی ان کا دامن تر نہیں ہوا اور نہ ان پر بدعنوانی اور کنبہ پروری وغیرہ میں ملوث ہونے کا الزام لگا، وہ لوگوں کے ایسے ذاتی کام کرنے سے گریز کرتے تھے، جن میں دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تھا، اس کی وجہ سے وہ لوگ ان کی بڑی شکایت کرتے تھے جو اپنے ذاتی مفاد اور مخصوص اغراض سے ان سے چمٹے رہتے تھے، اسی طرح جن کاموں میں دھاندلی اور بدعنوانی کا مرتکب ہونا پڑتا ہے، وہ خواہ ان کے عزیز اور دوست ہی کا کام کیوں نہ ہو اس میں نہیں پڑتے تھے، وزیر ہوتے ہوئے نہ انہوں نے خود ناجائز فائدے اٹھائے اور نہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو اس کا موقع دیا، خود بدعنوانیوں سے بچنا آسان ہے مگر وہ اپنے دائرہ اختیار کے لوگوں کو بھی ان کا مرتکب نہ ہونے دیتے تھے، ان کے مدرسہ کے سفرا یا وہ خود ملک یا بیرون ملک جاتے اور انہیں ہدایا وتحائف ملتے تو اسے مدرسہ ہی کے کھاتے میں رکھواتے تھے، معلوم ہوتا ہے احادیث میں ابن اللتبیہ کا جو واقعہ ہے وہ ان کے پیش نظر ہوتا تھا۔

تعلیمی میدان میں پہلے انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ عربی مدرسے قائم کئے جن کے طلبہ الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات دیتے ہیں، پھر جدید تعلیم کے لئے ایک انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا، چند برس پہلے ڈگری کالج کی منظوری بھی مل چکی ہے اور بی اے کی کلاسیں بھی چل رہی ہیں، دو تین برس سے بڑی تیزی سے کالج کی عمارتیں بن رہی تھیں، اللہ تعالیٰ غیب سے تکمیل کا سامان کردے۔

وہ اعظم گڈھ کے متعدد علمی و تعلیمی اداروں کے رکن تھے، ایک زمانے میں شبلی کالج کی انتظامیہ کے بڑے سرگرم رکن تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بھی وہ سرگرم ممبر تھے، اپنے اثر و رسوخ اور مفید مشوروں سے اس کو بڑا فائدہ پہنچاتے تھے، مولانا بدرالدین اصلاحی کے انتقال کے بعد جب میرا نام نظامت کے لئے تجویز ہوا تو میں کسی طرح اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو رہا تھا مگر وہ اڑ گئے کہ جب پورا ہاؤس اس پر متفق ہے تو آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں، انکار کرتے ہیں تو کوئی ایسا نام پیش کریں جس پر سب لوگ متفق ہو جائیں۔

جن مدرسوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا تھا ان کو بھی فائدہ پہنچاتے، ان میں جامعۃ الرشاد کا نام سر فہرست ہے، ہر انسان میں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں، ان سے بھی خدا اور بندگان خدا کے حقوق میں کمی اور کوتاہی ہوئی ہوگی، وہ بڑے اچھے منتظم تھے، مگر گفتگو میں ان کا طرز تخاطب اور لب و لہجہ اچھا نہیں ہوتا تھا، قول حسن کی قرآن مجید اور احادیث میں بڑی تاکید کی گئی ہے، لیکن وہ ایمان دار، دیانت دار اور بڑی خوبیوں کے انسان تھے، ان کی وفات ایک قومی و ملی حادثہ ہے، وہ اعظم گڈھ کے لئے مایہ فخر تھے، ان کی جیسی قدر کرنی چاہئے تھی نہیں کی گئی، آیندہ ان کی کمی بہت محسوس کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین) ”ض“

مطبوعات جدیدہ

اشاریۂ اقبالیات از محترمہ اختر النساء، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت مجلد، صفحات ۴۱۶، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور۔

علامہ اقبال کے کلام و افکار کے فروغ میں پاکستان کی اقبال اکادمی کی فعالیت محتاج تعارف نہیں۔ اس نیک نام ادارے کی اکثر مطبوعات کا ذکر ان صفحات میں آتا رہتا ہے، اس کا علمی مجلہ اقبال ریویو اپنے بلند پایہ مضامین کے لئے قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ۶۰ء سے نکلنے والے اس مجلہ کا نام ۸۵ء میں اقبالیات ہوگیا، لیکن اب تک اس کی اشاعت میں تسلسل برقرار ہے، اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کے مفید و متنوع مضامین کے مفصل اشاریے کی ضرورت تھی جس کو لائق مولف نے زیر نظر کتاب میں حسن و خوبی سے پورا کردیا ہے۔ کار تحقیق کو سہل و آسان بنانے میں علمی رسائل کی اشاریہ سازی کی خاص اہمیت ہے اور اب تو یہ اشاریے اس راہ میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ اشاریہ بھی جدید طرز پر مرتب ہے اور جامع ہے، ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اردو کے علاوہ مجلے کے انگریزی، فارسی، ترکی اور عربی شماروں کی مکمل فہرست بھی آگئی ہے، مقدمہ میں اقبال اکادمی اور رسالے کی گویا تاریخ بھی پیش کردی گئی ہے اس مفید اور اہم علمی کاوش کے لئے ادارہ اور مولفہ دونوں شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اسلام، معاشیات اور ادب (خطوط کے آئینہ میں) بنام پروفیسر محمد

نجات اللہ صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش صفحات ۴۲۸
قیمت درج نہیں، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

پروفیسر نجات اللہ صدیقی ماہر معاشیات ہیں، وہ ان چند خوش نصیبوں میں ہیں جنھوں نے موجودہ فن معاشیات کو اسلام کے نظام مالیات کی روح سے ہم آہنگ کرنے کی مبارک کوششیں کی ہیں، اردو اور انگریزی میں غیر سودی بینک کاری، نظریہ ملکیت، اسلامی معاشیات کی تدریس اور ریاست و اسلامی معیشت اور انشورنس وغیرہ جیسے مسائل پر ان کی فکر انگیز کتابیں دوسری اور زبانوں میں منتقل ہوئیں، انہوں نے ادب اور سیاست کے موضوع پر بھی اسی رنگ میں قابل قدر مضامین لکھے جس کی وجہ سے اصحاب فکر و نظر کی توجہات ان کی جانب مبذول ہوئیں، زیر نظر کتاب میں تقریب اسی (۸۰) اہل علم و دانش کے مکاتیب ہیں، ان میں ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلی مودودی، مولانا علی میاں، مولانا امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی جیسے مشاہیر کے خطوط بھی ہیں، بعض کے جواب بھی فاضل مرتب کے قلم سے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ان خطوط میں "معاشیات اسلام یا ادب کی باتیں زیادہ گہری نہیں آسکی ہیں اور جذبات کا بے تکلف اظہار چند اصولوں کی پاسداری اور قدروں کے فروغ تک محدود رہا"۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان خطوں میں دردمندی اور خلوص کے ساتھ ان مسائل کی کنہ و حقیقت پر جس طرح اظہار خیال کیا گیا وہ شاید طول طویل مباحث کے انبار سے زیادہ اہم اور وقیع ہے، خاص طور پر مولانا مودودی کے خطوط میں ان کی شخصیت و فکر کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے [illegible] سامان ہے، محظورات کی اباحت کا دروازہ کھولنے کے متعلق

ان کا یہ سوالیہ جملہ بڑا اہم ہے کہ "اس کے بعد جو حدود ٹوٹیں گی ان کی ذمہ داری آخر کون لے گا؟" اور یہ قول بھی کہ "ایسی بات کرتے ہوئے میری روح کانپ جاتی ہے جو بے لگام اجتہادات کا دروازہ کھولنے کی ذمہ داری میں مجھے شریک کرے"۔ کرایہ پر دی جانے والی اشیاء اور کمپنیوں پر زکوۃ محسوب کئے جانے کے متعلق مولانا مرحوم کے دلائل اسی احتیاط کا نمونہ ہیں، ابو نصر محمد خالدی، پروفیسر خورشید احمد، سید زین العابدین وغیرہ کے خطوط کا بھی یہی حال ہے جن میں سطر سطر میں اسلام اور علوم اسلامیہ کے متعلق سوز کے ساتھ فکر اور مسائل کے حل کی جستجو ہے، خالدی صاحب کا خلافت و ملوکیت کے متعلق تبصرہ بھی بڑا دلچسپ ہے، ایسے مجموعے اردو میں شاذ ہیں، اس کی پذیرائی ہونا چاہیے۔

اسلامی طب (شاہانہ سرپرستیوں میں) از جناب ابن منظر قاضی معین اللہ ابن رہبر فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۹، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: مکتبہ عین العلوم، مکان نمبر ۱۷-۳-۳۰۵/۱، املی بن، یاقوت پورہ، نزد جامع مسجد املی بن، حیدر آباد ۲۳۔

اس کتاب کے مولف عہد آصفیہ کے حیدر آباد میں نظامیہ طبی کالج سے وابستہ تھے اسی زمانہ میں ان کے کئی مضامین معارف میں بھی شائع ہوئے تھے، طب اور جدید سائنس سے ان کو خاص شغف تھا، اس موضوع پر ان کی دو اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں لیکن ان کی بہترین تالیف زیر نظر کتاب تھی جس میں انہوں نے علم و فن طب کے فروغ کے لئے اسلامی حکومتوں کی فیاضانہ سرپرستی کی داستان رقم کی تھی، بنو امیہ، بنو عباس اور غزنوی و سلجوقی حکمرانوں اور مصر و اندلس کی حکومتوں کے علاوہ ہندوستان خصوصاً ارض دکن کے بادشاہوں کے عہد میں طب کی ترقی اور اطبائے اسلام کی علمی و تحقیقی کاوشوں اور

فن پیمان کے عبور کی تفصیل نہایت محنت و جامعیت سے پیش کی تھی، اس کتاب سے بعض ایسی نادر کتابوں کے وجود کا علم ہوا تھا جن کے صرف نام معلوم تھے، اس کاوش کے حسن قبول کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود آصف جاہ سابع نے کتاب خریدی اور مصنف کو انعام سے نوازا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی لکھا کہ کتاب مفید پُراز معلومات اور دلچسپ ہے، خوشی کی بات ہے کہ طب اسلامی کے احیاء کے مقصد سے اس کے طبع جدید کا اہتمام کیا گیا جو آج بھی اسی درجہ مفید و دلچسپ ہے۔

بھارت میں چار ہفتے از جناب سید علی اکبر رضوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۶۲، قیمت ڈیڑھ سو روپے، پتہ: محمد اسلام عمری ادارہ تصنیف و تالیف، پان والی کوٹھی، علی گڑھ۔

اس خوبصورت اور دلچسپ سفرنامے کے وقائع نگار پاکستان کے ایک ممتاز صنعت کار و تاجر ہیں، تجارت کی غرض سے انہوں نے کثرت سے سفر کئے اور جہاں گرد و جہانیاں جہاں گشت کہلائے، لیکن مادی منافع کے ساتھ انہوں نے علم و حکمت کی دولت بھی ہاتھ سے نہ جانے دی، جس کا اظہار ان کے دوسرے سفرناموں سے ہوتا ہے، اصلاً وہ ہندوستانی ہیں، اعظم گڈھ ان کا مولد ہے، چند سال قبل لکھنؤ کے ایک ادارے کی تقریب میں شرکت کے لئے ہندوستان آئے تو علی گڑھ، اعظم گڈھ، بنارس اور کلکتہ میں بھی کچھ کھوئے ہوؤں کی جستجو اور یافت میں گزرے، زیر نظر کتاب اسی کی سرگزشت اور دلچسپ داستان ہے اور یہ محض تاثرات و احساسات نہیں، ایک باخبر سیاح کے مشاہدات کے مانند پُراز معلومات بھی ہے، زبان و بیان کی لذت و حلاوت نے اس کو اور بھی لطیف و لذیذ بنا دیا ہے، دارالمصنفین کے ذکر میں عجب سرشارانہ کیفیت ہے، ایک جگہ انہوں نے

موازنہ انیس و دبیر کی شایان شان طباعت اور ایک جدید حیات شبلی کی اشاعت کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، حضرت سید صاحبؒ کی نشست گاہ اور میز کو علامہ شبلی نعمانیؒ سے سہواً منسوب کر دیا گیا ہے، اس سفر کی یادگار خاصی رنگین تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔

تذکرہ مشاہیر غازی پور از جناب مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۴، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: دینیہ اکیڈمی مدرسہ دینیہ، زیر قلعہ غازی پور، یوپی۔

مشرقی یوپی کا ضلع غازی پور، اودھ اور بنارس کی طرح قدیم بستی ہے، لیکن ساڑھے چند سو سال پہلے مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ آباد ہوا اور علماء و صوفیہ، ادبا، شعرا اور دینی علمی و تعلیمی مراکز کی کثرت سے مانند نیشاپور ہوگیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تو اس کو بعض حیثیتوں سے عالم اسلام میں مقام بلند کا حامل خطہ قرار دیا ہے، سر سید، مولانا فاروق چریا کوٹی، حکیم عبدالوہاب نابینا، آسی غازی پوری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ڈاکٹر سید محمود جیسے مشاہیر کی شہرت کا آفتاب اسی مطلع مشرق پر بلند و روشن ہوا، لیکن اس مردم خیز بستی کے حالات اب تک سحاب خفا میں مستور تھے۔ فاضل مصنف نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ قریب دو سو سال قبل مسیح سے اب تک اس کی منتشر تاریخ کو جمع کر کے عہد بعہد حکمرانوں، قصبات، قریوں، ممتاز خانوادوں اور مذہبی و علمی یادگاروں کو سلیقے سے ایک لڑی میں پرو دیا، بعض اسلامی تحریکوں خصوصاً ملک کی آزادی کے لئے اس اسم بامسمیٰ سرفروش بستی کی داستان حمیت و غیرت کے علاوہ یہاں کی سینکڑوں شخصیتوں کے احوال بھی مستند شکل میں محفوظ کر دئے، اس طرح یہ محض ایک خاص خطہ کی تاریخ سے کہیں زیادہ ایسی مفید و پُراز معلومات تاریخ ہوگئی جس کے متعلق بجا طور پر

کہا گیا کہ اس کی مثال کم ملتی ہے، کتاب غیر معمولی طور پر اغلاط سے صاف ہے، لیکن استاد مرحوم مولانا شاہ ابوالقاسم کو فہرست میں ابوالقساسم لکھ دیا گیا۔

قفسِ رنگ از جناب شیث محمد اسمٰعیل اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۰۸، قیمت درج نہیں، پتہ: اعظمی کاٹج ۱۱/۳۲ ذاکر نگر ویسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵۔

اس مجموعہ اشعار کے شاعر اچھے نثر نگار بھی ہیں، ان کی کئی کتابیں مثلاً مغربی افریقہ میں مسلمان، عہد سلطنت کے فقہاء وصوفیہ کی نظر میں ہندو کی حیثیت اور دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات وغیرہ شائع ہو چکی ہیں، لیکن شدت احساس موزونی طبع اور شعری وادبی ماحول نے دل پر گزرنے والی واردات کو رقم کرنے کا ذوق بخشا، یہ مجموعہ تنہائیوں اور خلوتوں میں اسی مشغلہ خود کلامی کا نتیجہ ہے، شاعر کو احساس ہے کہ صورتِ آوازِ صحرا یہ غزلیں چھپ بھی گئیں تو کیا ہوگا، لیکن ؎

جنوں نہاد ہے یزداں صفات ہے کیا ہے ۔۔۔ یہ میرا دل ہے تری کائنات ہے کیا ہے

اور

اسی کے رنگ میں ہم نے اسے خطاب کیا ۔۔۔ غزل کو پردہ کیا شعر کو حجاب کیا

جیسے اشعار شاعر کے ساتھ قاری کو ایک رشتہ درد سے جوڑ دیتے ہیں، یہ کامیابی کیا کم ہے۔

دینی تقاریب کا گلشن از مولانا محمد حنیف ملی مرحوم، صفحات ۸۸، قیمت ۲۰ روپے
پتہ: ابو عالیہ ندیمی، ۵۵۴ بیل باغ، مالیگاؤں۔

مولانا محمد حنیف ملی مرحوم مالیگاؤں کی ممتاز درس گاہ معہد ملت کے شیخ الحدیث تھے، صاحب قلم بھی تھے اور اسلوب شگفتہ اور دلکش تھا، زیر نظر رسالہ میں سیرت طیبہ، ہجرت، نکاح اور محرم، رمضان اور عیدین کے موضوع پر ان کی چند تحریروں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

ع۔ ص۔